قرآن اور جستجوئے علم

(سوالات و جوابات)

جوابات از

علمائے قم و نجف

مرتبہ

مجاہد حسین حرؔ

ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔

نام کتاب .... قرآن اور جستجوئے علم (سوالات و جوابات)

جوابات از .... علمائے قم و نجف

مرتبہ .... مجاہد حسین حرؔ

پروف ریڈنگ .... خانم شازیہ غضنفر

کمپوزنگ .... قائم گرافکس۔ جامعہ علمیہ۔ ڈیفنس فیز ۴

ناشر .... مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

ہدیہ ....

ملنے کا پتہ

معراج کمپنی

بیسمنٹ میاں مارکیٹ، غزنی سٹریٹ اردو بازار۔ لاہور

03214971214، 04237361214

محمد علی بک ایجنسی اسلام آباد

03335234311

انتساب

قرآن کریم

سے

انس و محبت

رکھنے والوں

کے نام

عرض ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ محسن ملت سید صفدر حسین نجفی اعلی اللہ مقامہ کی ان صدقاتِ جاریہ میں سے ہے جس سے لوگ تا قیامت استفادہ کرتے رہیں گے اور موصوف کے درجات عالیہ میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ مصباح القرآن ٹرسٹ نے تراجم و تفاسیر قرآن سے کام شروع کیا اور پھر ہر وہ کتاب جس کی ملت کو ضرورت تھی شائع کی انشاء اللہ العزیز شائع کی جاتی رہے گی۔

موجودہ کتاب "قرآن اور جستجوئے علم" قرآنی معرفت کا ایک سلسلہ ہے۔ قرآن مجید سے شغف رکھنے والوں کے لئے یہ کتاب ایک مفید تحفہ ہوگی۔ ہمیں امید ہے کہ یہ کتاب انشاء اللہ آپ کو پسند آئے گی۔

یاد رہے کہ مصباح القرآن نے اپنی تمام کتابیں آپ کے استفادہ کے لئے انٹرنیٹ پر دے دی ہیں۔ ایڈریس ہے:

www.misbahulqurantrust.com

قارئین کرام سے التماس ہے کہ اگر وہ اس کتاب میں کہیں خامی دیکھیں یا کمی محسوس کریں تو ہمیں مطلع ضرور فرمائیں ہم آپ کے شکرگزار ہوں گے۔ ادارہ کے ترقی اور اس کے بانی محسن ملت سید صفدر حسین نجفی اعلی اللہ مقامہ کے درجات کی بلندی کے لئے دعا کے طالب ہیں۔

ادارہ

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

فہرست کتاب

سورہ مریم کی آیت نمبر ۱۷ میں، خداوند متعال کے اس قول "...فَأَرْسَلْنَآ إِلَيْهَا رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا" کا معنی کیا ہے؟ تمثل کے بارے میں وضاحت فرمایئے۔ 7

بعض ملائکہ خداوند متعال کی عبادت و تسبیح کے علاوہ کوئی اور کام انجام نہیں دیتے ہیں۔ کیا ان کا یہ عمل اختیاری ہے یا غیر اختیاری؟! اور اگر ملائکہ اختیار نہیں رکھتے ہیں، تو کیا خداوند متعال اس قسم کی عبادت کا محتاج ہے؟ 16

یہ جو بعض اولیائے الٰہی "ما کان وما یکون وماھو کائن" (ماضی، حال اور مستقبل) کا علم رکھتے تھے، اس سے کیا مراد کیا ہے؟ 22

سورہ آل عمران کی آیت ۱۹ إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ میں اسلام کو کبھی خدا کے برابر تسلیم کے معنی میں تاویل کر کے اسے اسم مصدر جانتے ہیں، مہربانی کر کے اس سلسلہ میں وضاحت فرمایئے۔ 32

اگر عصمت کا مقام خداوند متعال کی طرف سے ایک مہربانی ہے تو ایک معصوم اور ایک غیر معصوم کے مرتکب گناہ نہ ہونے کے اجر کو کیسے بیان کیا جاسکتا ہے؟ 40

کیا قیامت کبریٰ کے وقت خدا وند متعال کے علاوہ تمام موجودات مر جائیں گی؟ حتی عزرائیل بھی؟ 47
کیا انسان میں برزخ اور قیامت کی نعمتوں اورعذاب کو درک کرنے کی توانائی ہے؟ 60
یہ جو کہا جاتا ہے کہ خداوند متعال آسمانوں اور زمین کا نور ہے، کیا اس نور سے مراد محسوس نور ہے؟ اگر محسوس نور نہیں ہے، تو کس معنی میں ہے؟ 74
شیطان، ہماری فکر و اندیشہ میں کیسے نفوذ کر کے اپنے عزائم کو القا کرتا ہے؟ 85
سورہ شوریٰ کی آیت نمبر ۲۳ میں لفظ القربیٰ سے کیوں اہل بیتؑ کا مراد استنباط کرتے ہیں؟ 91
ایک مسلمان کے ابتدائی ترین اعتقادات کیا ہیں؟ 103
قرآن مجید کے دفعتا اور تدریجی سے آج تک کتنا زمانہ گزر رہا ہے؟ 110
کسی گناہ کے مرتکب ہوئے بغیر نوجوان کا حضرت خضر کے ہاتھوں قتل کئے جانے کی کیا توجیہ کی جاسکتی ہے؟ کیا یہ کام سنت الٰہی کے منافی نہیں ہے؟ 115

سورہ مریم کی آیت نمبر ۱۷ میں، خداوند متعال کے اس قول "...فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا۝۱۷" کا معنی کیا ہے؟ تمثل کے بارے میں وضاحت فرمائیے۔

مختصر جواب

تمثل کا لغوی و اصطلاحی مفہوم: تمثل، یعنی کسی کے سامنے کھڑا ہونا، کسی کے بارے میں کسی چیز کا تصور پیدا ہونا، جیسے کسی چیز کا ہونا، تصور کرنا۔ مذکورہ آیہ شریفہ میں تمثل سے مراد یہ ہے کہ: ایک فرشتہ الٰہی انسان کی شکل میں آکر حضرت مریمؑ کے سامنے کھڑا ہوا اور حضرت مریمؑ نے خیال کیا کہ وہ سیرت وصورت کے لحاظ سے انسان ہے۔ لیکن حضرت جبرئیل صرف ظاہری شکل وصورت میں انسان جیسے تھے، نہ یہ کہ حقیقت میں انسان ہوتے، کیونکہ یہ اس کی ذات میں ایک تبدیلی اور دگرگونی کا سبب بن جاتا اور یہ ناممکن اور محال ہے۔

قرآن مجید میں لفظ تمثل صرف سورہ مریم کی آیت نمبر ۱۷ میں آیا ہے، لیکن اسلامی روایات اور دوسری کتابوں میں یہ لفظ متعدد مقامات پر کافی استعمال ہوا ہے، جیسے: انسان کے اعمال میں ابلیس، دنیا، مال اور اولاد کا تمثل اور اس کے علاوہ بہشت میں قرآن مجید کا تمثل...

مسئلہ تمثل کے سلسلہ میں ممکن ہے کچھ شکوک وشبہات پیدا ہو جائیں۔ان میں سے ہم ذیل میں تین شبہات اوران کے جواب کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

۱۔تمثل کے سلسلہ میں ادراک میں خطا کا احتمال ہے لہٰذا ادراک کرنے والے کا ادراک صحیح ہونے کا معیار کیا ہے؟ جواب: قضایای ذہنی میں قضیہ کے صحیح ہونے کا معیار اس کا قضیہ کے نفس الامر سے منطبق ہونا ہے کہ وہ محسوس وجود خارجی کے لحاظ سے زیادہ عام ہے۔

۲۔قرآن مجید کی بعض آیات اور اسلامی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان عالم ملکوت سے رابطہ قائم کرسکتا ہے، کیونکہ سورہ اعراف کی آیت نمبر ۱۸۵ میں خداوندمتعال توبیخ، ترغیب وتحریک کے مقام پرفرماتا ہے کہ تم لوگ کیوں عالم ملکوت اور دنیا کے باطن پر نظر نہیں کرتے ہو؟اس کے علاوہ عرفا کہتے ہیں:انسان میں عالم ملکوت کی طرف عروج کرنے کی صلاحیت، شایستگی اور استعداد موجود ہے اور حضرت مریمؑ کے لئے جبرئیلؑ کا تمثل اس کا ایک واضح نمونہ ہے، کیونکہ حضرت مریم نہ پیغمبر تھیں اور نہ وصی بلکہ وہ صرف ایک اولیائے الٰہی تھیں۔

۳۔کیا عالم غیب سے دنیا اور عالم فطرت میں پلٹ کر آنا، کمال سے نقص وعیب کی طرف رجوع کرنا نہیں ہے اور ملا صدرا کے فلسفہ میں پیش کی گئی حرکت جوہری کے نظریہ سے منافی نہیں ہے؟

جواب: اس وقت عالم غیب سے عالم دنیا کی طرف پلٹ کر آنا محال ہے جب کوئی مخلوق حرکت جوہری سے کمال حاصل کر کے فعالیت اور مطلوب تک پہنچ گئی ہو، اوراس کمال کو کھو دینا اور ضایع کردینا چاہتی ہو، لیکن تمثل اور اس کے مانند (رجعت) میں یہ معنی محال ہے اور ضروری نہیں ہے، بلکہ وہ مخلوق اپنے تمام کمالات اور وجودی وسعت کی شخصیت کا تحفظ

کرتے ہوئے تمام عالمین اور عالم فطرت یعنی دنیا میں توجہ کرسکتی ہے۔ جیسے خداوند متعال کی ذات حق کی انسان اور دنیا کے لئے ظہور و تجلی، جو خلقت کی پیدائش اور سرچشمہ قرار پائی ہے۔

تفصیلی جواب

سورہ مریم کی آیت نمبر ۱۷ کا ترجمہ: اور لوگوں کی طرف پردہ ڈال دیا تو ہم نے اپنی روح کو بھیجا تاکہ ایک خوبصورت انسان کی شکل میں پیش آیا۔

تمثّل کا لغوی و اصطلاحی مفہوم: لفظ تمثّل تصور کرنے[1] کے معنی میں ہے، جیسے کسی چیز کے مانند ہونا، کسی کے سامنے کھڑا رہنا اور کسی کے لئے کسی چیز کا تصور پیدا ہونا۔[2] اور کہا جاسکتا ہے کہ، تمثّل حقیقت میں مادہ مثول سے کسی شخص یا چیز کے سامنے کھڑے رہنا ہے، اور ممثّل ایک ایسی چیز کو کہا جاسکتا ہے جو دوسرے کی شکل میں نمایاں ہوتی ہے۔ اس بنا پر فتمثل لہا بشراً سویاً کا مفہوم یہ ہے کہ ایک فرشتہ الٰہی انسان کی شکل وصورت میں ظاہر ہوا۔ بیشک اس بات کے معنی یہ نہیں ہیں کہ جبرئیل صورت وسیرت میں ایک انسان میں تبدیل ہوگئے ہیں، کیونکہ اس قسم کی تبدیلی اور دگرگونی ملائکہ کے لئے ممکن نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ ایک انسان کی صورت میں ظاہر ہوئے اگر چہ سیرت کے لحاظ سے وہی فرشتہ تھے، لیکن حضرت مریمؑ کو ابتدا میں اس کی خبر نہیں تھی، اس لئے انہوں نے یوں تصور کیا کہ وہ ایک ایسی مخلوق کے سامنے ہیں، جو سیرت وصورت میں انسان ہے۔[3]

آیہ شریفہ میں تمثّل، اس کے اسی لغوی معنی میں ہے، یعنی کسی کے لئے کسی چیز کا تصور اور ظاہر ہونا۔ قرآن مجید میں لفظ تمثّل صرف حضرت مریمؑ کے لئے استعمال ہوا ہے۔ لیکن اسلامی روایات اور تاریخ میں تمثّل اور اس کے مشابہ الفاظ (تنصب، تصور، تبدل، سخ، ظہور ...) بہت زیادہ پائے جاتے ہیں اور یہ لفظ وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے۔ من جملہ: ابلیس کا دارالندوہ میں ایک خیر خواہ بوڑھے کی شکل میں تمثّل پیدا کرنا جس نے قریش کے

سرداروں کو فریب دیا اور یا دنیا اور اس کے باطن کا ایک خوبصورت عورت کے روپ میں حضرت علی علیہ السلام کے سامنے ظاہر ہونا اور انسان کے مال، اولاد اور عمل کا موت کے وقت خاص اور مختلف شکلوں میں اس کے سامنے مجسم ہونا یا انسان کے اعمال اور عبادتوں کا قبر میں اور قیامت کے دن مختلف اور مخصوص صورتوں میں تمثل اور تجسم ہونا۔ اور اس کے علاوہ بہشت میں مومن قاری قرآن کے لئے قرآن مجید کا نیک اور بلند درجہ کی صورت میں تمثل و تجسم ہونا اور اسی کے مانند اسلامی کتابوں میں آیا ہے۔

ان تمام مواقع پر تمثل کے مفہوم و معنی یہ ہیں کہ کوئی چیز یا شخص کسی دوسری شکل میں کسی انسان کے سامنے ظاہر ہو جائے، بغیر اس کے کہ اس کی ذات اور ماہیت میں کوئی تبدیلی واقع ہو جائے۔

اس دعویٰ کا ایک واضح نمونہ سورہ ہود کی آیت نمبر ۶۹ اور ۷۰ ہے جس میں حضرت ابراہیمؑ علیہ السلام کے پاس آئے ہوئے فرشتوں کا تجسم و تمثل ہونا بیان ہوا ہے۔ جناب استاد علامہ شعرانیؒ اپنی کتاب راہ سعادت میں کہتے ہیں: قرآن مجید میں آیا ہے کہ جب فرشتے حضرت ابراہیمؑ علیہ السلام کے پاس آگئے تا کہ انہیں حضرت اسحاقؑ کی بشارت دیدیں، تو حضرت ابراہیمؑ علیہ السلام نے ایک گوسالہ کو ذبح کر کے کباب بنا کر ان کے سامنے رکھا اور دیکھا کہ وہ گوسالہ کو ہاتھ نہیں لگاتے ہیں، حضرت ابراہیمؑ کو ان کا یہ طرز عمل پسند نہیں آیا اور ڈر گئے۔ لیکن تورات میں آیا ہے (تورات سفر تکوینی ۱۸، ۸) کہ فرشتوں نے اس گوسالہ کو کہا یا، لیکن صحیح وہی ہے جو قرآن مجید فرماتا ہے، کیونکہ فرشتے دنیا کی غذا نہیں کہاتے ہیں۔ اگر قرآن مجید کی حکایتیں تورات سے نقل کی گئی ہوتیں تو اس کے مانند ہوتیں، لیکن یہ پروردگار کی طرف سے وحی الٰہی ہے کہ وہ جانتا ہے کہ فرشتے غذا نہیں کھاتے ہیں، اور جس نے تعلیم حاصل نہیں کی ہے، حکمت الٰہی کے رموز سے آگاہ نہیں ہے اور عالم مجردات کی خبر نہیں رکھتا ہے، وہ اس قسم کے امور کو

نہیں سمجھ سکتا ہے...[4]

معلوم ہوا کہ جو احادیث ملائکہ کے بارے میں روایت کی گئی ہیں کہ وہ مختلف صورتوں میں دکھائی دیتے تھے، اس سے مراد ان کی ذات و حقیقت کو ظاہری آنکھوں سے دیکھنا نہیں ہے، کیونکہ ان کی اصل، روحانی اور مجرد ہے، بلکہ ان کا ظہور ادراک کرنے والوں کے ادراک کی ظرفیت کے مطابق ہے کہ وہ مجرد حقائق سے خالی ہونے کے بغیر ادراک کرنے والوں کے وجود کے دائرہ میں مختلف صورتوں میں ظہور پیدا کرتے ہیں، جسے قرآن مجید نے تمثل سے تعبیر کیا ہے۔

یہ جو ہم نے بغیر تجافی کہا اس سے مراد یہ ہے کہ فرشتہ کا نفسی وجود، جو اس کی حقیقی ذات ہے اپنی حقیقت سے خارج نہیں ہوتا ہے اور اس کی ذات انسان کی حقیقت میں اسطرح تبدیل نہیں ہوتی ہے کہ ہو بہو انسان میں بدل جائے، بلکہ اس کی ذات حقیقت ادراک کی ظرفیت میں انسان کی صورت میں تمثل پیدا کرتی ہے اور مجرد کے قوہ ادراک نے جو فرشتہ کی حقیقت مجرد سے رابطہ پیدا کیا ہے وہ ادراک کرنے والا اپنے ادراک کی ظرفیت کے مطابق اپنے قوہ خیال میں، جو بذات خود تجرد برزخی کا حامل ہے، ادراک کرنے والے کے نفسانی حالات کے مطابق متمثل ہوتا ہے۔[5]

تمثل کے سلسلہ میں ممکن ہے ذہن میں چند شبہات اور سوالات پیدا ہو جائیں کہ ان میں سے بعض کی طرف ہم ذیل میں ان کے جواب کے ساتھ اشارہ کرتے ہیں:

(۱) تمثل کے سلسلہ میں، کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ادراک کرنے والا شخص کسی چیز کو غلطی سے ادراک کرے اور پھر ایسا تصور کرے کہ وہ چیز حقیقی اور واقعی تھی، جبکہ اصل میں کوئی حقیقت نہیں تھی۔ دوسرے الفاظ میں ادراک کرنے والے کے ادراک کا معیار کیا ہے؟

جواب: اس مسئلہ کی یاد دہانی کرانا ضروری ہے کہ معرفت شناسی کی بحث میں یوں

کہا گیا ہے کہ شناخت و ادراک عبارت ہے: خود شے یا اس کی جزئی صورت کا حاضر ہونا (ظاہری صورت اور انفرادی مشخصات میں) یا ادراک کرنے والے کے پاس اس کا کلی مفہوم۔ خود شے کا حضور جیسے میرے اور میرے حالات میرے نزدیک اور کسی چیز کی جزئی صورت میں حضور، جیسے انسان، حیوان اور پہاڑ کی کلی صورت کا میرے پاس حاضر ہونا۔ یہ تعریف علم حضوری اور علم حصولی پر مشتمل ہے۔[6]

یہ امر بھی مسلم ہے کہ حسی اور خیالی معرفتوں میں ہمارا مدرک (ادراک کرنے والا) ایک جزئی امر ہے۔ لیکن اس فرق کے ساتھ کہ خیالی ادراک میں، ادراک کرنے والے کے حسی ادراک کے برعکس محسوس کی صورت میں مادہ کے حضور کے بغیر قابل تصور ہے۔ مذکورہ مسئلہ کے پیش نظر، تمثّل، جو عبارت ہے، انسان کے لئے کسی چیز کا، اس صورت میں ظہور کہ انسان اس سے محبت رکھتا ہے اور اس کا ظہور اس کی غرض کے مطابق ہوتا ہے، جیسے، جبرئیلؑ کا ایک مکمل انسان کی صورت میں حضرت مریمؑ کے سامنے ظاہر ہونا۔ چونکہ انسان کا رسالت سے معمول یہی ہے کہ شخص رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی رسالت کو لے کر مرسل الیہ کے پاس آتا ہے، اور جو کچھ لے آتا ہے اسے گفتگو کی صورت میں ادا کرتا ہے اور اس سلسلہ کو باطل وہمی اور تخیلی امر سے مخلوط نہیں کرنا چاہئے جو سراب کے مانند ہوتا ہے۔ جس طرح سوفسطائی اپنا نظریہ پیش کرتا ہے کہ: کوئی بھی چیز ایسی نہیں ہے جیسا کہ ہم اس کا ادراک کرتے ہیں، کیونکہ اس گروہ کا استدلال یہ ہے کہ ایک حقیقت کے واقعی صورت میں ظاہر ہونے، جو ادراک کرنے والے کا معمول ہے، اور اس کے ادراک کے مطابق ہونے اور خارج میں اصلاً وجود نہ رکھنے اور صرف ایک تصوراتی صورت ادراک ہونے کے درمیان فرق ہے، یہ دوسری حالت سوفسطائی ہے نہ کہ پہلی۔ اور علم حصولی میں اس سے زیادہ توقع رکھنا ایک بے جا توقع ہے۔[7]

ضمناً قابل ذکر بات یہ ہے کہ اسلامی فلسفہ میں، معیار اور صحیح اور غلط ہونا، ادراک شدہ قضیہ کے حقیقت کے مطابق ہونا ہے، خواہ قضیہ خارجی ہو یا ذہنی اور یا اعتباری یا نفس الامری۔ اس بنا پر ذہنی قضایا میں صدق کا معیار ان قضایا کے نفس الامری سے مطابقت رکھنا ہے کہ وہ وجود خارجی محسوس سے زیادہ عام ہے۔[8]

(۲) کیا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے وصی کے علاوہ کوئی اور شخص جبرئیل کو دیکھ سکتا ہے عالم ملکوت سے رابطہ پیدا کرسکتا ہے؟ جیسے حضرت مریمؑ؟

جواب: قرآن مجید کی بعض آیات اور اسلامی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان عالم ملکوت سے رابطہ قائم کرسکتا ہے، کیونکہ سورہ اعراف آیت نمبر ۱۸۵ میں خداوند متعال توبیخ، ترغیب وتحریک کے مقام پر انسانوں کو عالم ملکوت اور دنیا کے باطن کا ادراک کرنے کے لئے دعوت دیتا ہے: اَوَلَمۡ یَنۡظُرُوۡا فِیۡ مَلَکُوۡتِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ۔ اور عرفاء کے قول کے مطابق حضرت ابراہیمؑ علیہ السلام کے واقعات (انعام۔۷۵) اور حضرت مریم علیہا السلام کی داستان سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر انسان عالم ملکوت کی طرف پرواز کرنے کی صلاحیت، شائستگی اور استعداد رکھتا ہے، کیونکہ تمثل آئینہ میں کسی چیز کی تصویر دکھائی دینے کے مانند ہے کہ وہ چیز اپنی جگہ پر قائم ہوتی ہے اور آئینہ میں بھی ظہور پیدا کرتی ہے۔ عالم مجرد کا ادراک کرنا اور ملائکہ اور ماورائے فطرت ارواح کو دیکھنا بھی ایک صورت میں اسی کے مانند ہے۔ یہ تصور نہیں کیا جانا چاہئے کہ یہ مقام صرف نبی یا اس کے وصی تک محدود ہے، کیونکہ حضرت مریمؑ نہ نبی تھیں اور نہ وصی بلکہ صرف اولیائے الٰہی میں سے تھیں۔[9]

(۳)۔ کیا عالم غیب سے عالم فطرت میں پلٹ کر آنا، کمال سے عیب کی طرف رجوع کرنے کے مترادف نہیں ہے اور ملا صدرا کے فلسفہ میں پیش کی گئی حرکت جوہری کے نظریہ سے منافی نہیں ہے؟ یعنی کسی مخلوق کے فعلیت کی حالت پر پہنچنے کے بعد پھر سے بالقوہ

حالت کی طرف پلٹنا اور کیا اپنے اعلی اور کمال کے مطلوب کو چھوڑ دینا تمثل میں مشکل پیدا نہیں کرتا ہے؟

جواب: عالم غیب سے دنیا اور عالم فطرت کی طرف پلٹنا اس وقت محال ہے کہ جب کوئی مخلوق کمال جوہری کو حاصل کرنے کے بعد اسے کھو دے اور اپنے حاصل کئے گئے عالی فعلیت کی حالت کے کمال کو ضائع کر دے، جو اس کی ذات میں تحول وتبدل پیدا کرنے کا سبب بن چکا ہو۔ یہ معنی تمثل اور اس کے مانند امور (جیسے مسئلہ رجعت) پر لاگو نہیں ہوتا ہے، کیونکہ اس حالت میں قوت وجودی اور وجود وشخصیت میں اپنی وسعت کے پیش نظر نفس، تمام عالموں کو اس معنی میں تحفظ دے اور اس صورت میں عالم پر مکمل توجہ رکھتا ہے اور اس کے علاوہ عالم فطرت و دنیا پر بھی توجہ رکھتا ہے۔[10] جیسا کہ عرفا خداوند عالم کے انسان اور کائنات کے لئے تجلی اور ظہور کے بارے میں بیان کرتے ہیں، اس معنی میں عرفا اعتقاد رکھتے ہیں کہ، چونکہ خداوند متعال نے ارادہ فرمایا ہے کہ وہ مخفی ہونے کی حالت سے باہر آئے (مخفی ایک ایسا مرتبہ ہے کہ اس میں تعین اور قید نہیں ہے اور ایک لاتعینی اور اطلاق ذاتی کا مرتبہ ہے) اور اپنے جمال وصفات کو اشیا و افراد میں دکھلائے، پس اس نے دنیا وانسان میں جلوہ نمائی کی اور ان کو تخلیق کرنے کا اقدام کیا اور نتیجہ کے طور پر پہلا ذاتی تعین متحقق ہوا۔ (فکنت کنزاً مخفیاً فاجبت ان اعرف مخلقت الحق لکی اعرف... پس خداوند متعال کا انسان اور دوسری مخلوقات کو تخلیق کرنے کا مقصد اس کا ظہور و تجلی ہے۔[11]

اور فرشتوں کے تمثل کا سلسلہ بھی یہی مقولہ ہے، کیونکہ ملائکہ بدن محسوس کے حامل ہونے کے محتاج نہیں ہیں، لیکن بعض مواقع پر خدا کے حکم سے متمثل ہوتے ہیں اور مخصوص جسموں میں ظاہر ہوتے ہیں، جس طرح حضرت مریمؑ کی داستان میں اشارہ ہوا اور یہاں پر مذکورہ سوال کے بارے میں ابہام کو دور کرنے کے لئے یاد دہانی کراتے ہیں کہ: کبھی روح

کے عقلی عروج کے مقام کو حاصل کرنے کے لئے ظاہری اور جسمانی حواس کی ضرورت ہوتی ہے کہ اسے کل علوم و معارف ظاہری حواس کی روشنی میں روح کے جوہر سے حاصل کرنا چاہئے، تاکہ عقل بالفعل مکمل ہو جائے اور یہ دنیوی سیر اور حرکت جوہری ہے۔ اور کبھی وہی کامل روحانی قوت کمال حاصل کرنے کے بعد اپنے کو شکل وصورت کے عالم میں ظاہر کرتی ہے اور حس وقوائے حسیہ کی صورت میں نمایاں ہوتی ہے، اس تجلی اور ظہور کو تمثل کہتے ہیں۔ روح کی یہ قوت حواس خمسہ کی احتیاج تب تک پوری نہیں ہوسکتی ہے جب تک نہ فعل سے قوت میں نزول کرے، بلکہ اشراق روح کے معنی ہیں، مقام نازل کی نسبت جو بھی تنزل عالمی اور اپنے آپ کو اپنے مقام اعلی سے رہا کرنے کے درمیان فرق کو اشراق عالی کے مقام نازلہ اور تجلی پر نہ چھوڑے، تو وہ اس قسم کے وسوسوں اور اوہام سے دو چار ہوگا۔ لہٰذا واضح ہوا کہ نفس کامل کا دنیا میں پلٹ کر آنا (رجعت) اور حس کی ترقی، بشریت کے روپ میں [12] روح القدس کے تمثل کے مانند ہے۔

حواشی

[1]۔ راغب اصفہانی، مفردات، لسان العرب، واژہ ی تمثل۔

[2]۔ دھخدا، لغتنامہ، واژہ ی تمثل۔

[3]۔ علامہ ی طباطبائی، تفسیر المیزان، ج ١٤، آیہ ی ١٧ سورہ ی مریم، مکارم شیرازی، تفسیر نمونہ، ج ١٣۔

[4]۔ حسن زادہ آملی، انسان وقرآن، ص ٦٧۔

[5]۔ حسن زادہ آملی، انسان وقرآن، ص ٧١، کمرہ ای، میرزا خلیل، افق وحی، ص ٣٢٢، طبع آبان، ١٣٤٧ ش۔

[6]۔ مصباح یزدی، محمد تقی، آموزش فلسفہ ای، ج ١، فصل اول، بہ نقل انسان شناسی، سید حسین ابراہیمیان، ص ٧٢۔

[7]۔ نقل اوراز المیزان، ج ١٤، ص ٥٧۔

[8]۔سبحانی،جعفر،نظریہ المعرفہ،ص۲۱۷۔

[9]۔نقل اوراز محمد الہم ، درشرح فصوص الحکم،ص ٤۷ ،طبع اول، بہار ۱۳۷۸ش۔

[10]۔رفیعی قزوینی، سید ابوالحسن، رجعت ومعراج،ص ٤٤ ،طبع سوم۔

[11]۔انسان شناسی،ص ۱۱٤،طبع اول، بہار۱۳۸۱۔

[12]۔رفیعی قزوینی، سید ابوالحسن،،رجعت ومعراج،ص ٤٥۔

بعض ملائکہ خداوند متعال کی عبادت و تسبیح کے علاوہ کوئی اور کام انجام نہیں دیتے ہیں۔ کیا ان کا یہ عمل اختیاری ہے یا غیر اختیاری؟! اور اگر ملائکہ اختیار نہیں رکھتے ہیں، تو کیا خداوند متعال اس قسم کی عبادت کا محتاج ہے؟

مختصر جواب

خداوند متعال کو کسی بھی مخلوق کی کسی بھی عبادت کا کوئی فائدہ نہیں ہے، خواہ وہ مخلوق مختار ہو یا غیر مختار۔

لیکن اختیاری عبادت، عابد کے تکامل و عروج اور تدریجی رشد اور اس کے خدا سے وجودی تقرب میں شدت پیدا ہونے کے سلسلہ میں مفید ہے. اور تمام موجودات کی غیر اختیاری عبادت من جملہ ملائکہ، ان کے وجود کا اقتضا ہے اور ملائکہ کی یہ عبادت ان کے شہود رب اور حق تعالیٰ کی ہیبت و عظمت کے ادراک سے رفعت پاتی ہے، نہ کہ خداوند متعال کے ان کے یا ان کی عبادت کے احتیاج کی وجہ سے.

تفصیلی جواب

ملک ایک ماورائے فطرت مخلوق ہے. اس کے وجود کو ثابت کرنے کا طریقہ یا وحی

پر مبنی کتابوں اور بندگی کی طرف رجوع کرنا ہے یا اس مخلوق کی ان امدادوں کا تجربہ ہے جو اس نے بندوں (انبیاء واولیاء میں سے مخلصین) کی ایمانی زندگی میں کی ہیں.

یہ ماورائے فطرت مخلوق جسم وجسمانیت والی نہیں ہے کہ اس کی کمیت و کیفیت کے بارے میں بحث کی جائے یا قابل تصور ہو. البتہ یہ مخلوق بعض اوقات انسان کی شکل میں ظاہر کرسکتی ہے تا کہ انسان اسے بشر کی شکل میں دیکھ سکے جبکہ وہ حقیقت میں انسان نہیں ہے، جیسے حضرت مریم علیہا السلام[1] کا روح کا مشاہدہ کرنا ملا یکہ کا حضرت ابراہیمؑ علیہ السلام[2] یا حضرت لوط[3] علیہ السلام کے ہاں مہمان کی صورت میں حاضر ہونا اور جبرئیل امین علیہ السلام کا رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں رحیہ کلبی کی صورت میں حاضر ہونا. ہم صرف اس قدر جانتے کہ ان کے درمیان ان کے وجود کی نسبت سے محدودیت، تکثیر اور تنوع پایا جاتا ہے، لہٰذا ان میں سے بعض دنیا میں عذاب کے موکل ہیں، بعض برزخ میں عذاب کے موکل ہیں اور بعض قیامت میں عذاب کے موکل ہیں. بعض انسان کے نامہ اعمال کے کاتب ہیں اور بعض فیصلوں اور قضا اور قدر الٰہی کے کاتب ہیں، بعض امور کی تدبیر کرنے والے ہیں اور بعض وحی کو لانے والے ہیں، بعض دلوں میں الہام ڈالنے والے ہیں اور بعض مومنین کے محافظ، یاور اور حامی ہیں، بعض دوسروں پر امر وفرمانروائی کرنے والے ہیں اور بعض اپنے مافوق کے فرمانبردار، مطیع اور مامور ہیں اور بعض رزق کے موکل ہیں اور بعض بارش کے موکل ہیں اور ان میں سے بعض روح کو قبض کرنے والے ہیں. ان میں سے بعض ہمیشہ سجدہ کی حالت میں ہیں اور بعض ہمیشہ رکوع کی حالت میں ہیں اور بعض مسلسل تسبیح وتمجید کی حالت میں، بعض کعبہ، مقدس مقامات اور مومنین کی قبروں کے طواف اور زیارت میں مشغول ہیں، بعض مومنین اور شیعیان علی علیہ السلام کے لئے استغفار و شفاعت میں مشغول ہیں، بعض کفار ومشرکین ومنافقین اور اللہ کے دشمنوں پر لعن ونفرین کرنے میں مشغول ہیں. ملائکہ یہ ذمہ داریاں ایسے نبھاتے ہیں کہ ہر ایک

کی اپنی ذمہ داری اور ایک مقام ہے اور اپنے فریضہ سے نافرمانی کرنے کی قدرت نہیں رکھتے ہیں اور جو حکم انہیں ملے اس پر عمل کرتے ہیں.

عبادت، اپنے رب، مولیٰ اور مالک کی عبودیت کا اظہار کرنے کے علاوہ کچھ نہیں ہے. جس قدر حق تعالیٰ کی عظمت و ہیبت کا ادراک زیادہ ہو اسی قدر اس عظمت والے کے حضور اس کی عبودیت کا ظہور اور عجز کا اظہار زیادہ نمایان ہوتا ہے. بندگی کا یہ ظہور و اظہار خود بندے کے کمال و درایت کی علامت ہے اور اس کی اس عبادت سے خداوند متعال کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا ہے اور ضروری بھی نہیں کہ اس ذات اقدس کو کوئی فائدہ ملے تا کہ اس کے لئے یہ امر ان بندوں کی تخلیق وتکوین کا سبب بن جاتی، کیونکہ ان کی اصل تکوین اور تخلیق قدرت الٰہی کا ظہور اور انہیں وجود کی نعمت عطا کرنا ہے۔ اب اگر کوئی بندہ اختیار کے ساتھ عبادت کرے، اس کی یہ عبادت اس کے باطنی صفا اور اس کے کمال نفس کا سبب بن جاتا ہے اور اس کے نتیجہ میں اس کی عبودیت اور انسانیت کے مراتب میں ترقی حاصل ہوتی ہے۔ پس اس تسبیح وتمجید وتکریم وتعظیم کا اثر خود بندہ میں پیدا ہوتا ہے اور اس عبادت سے خداوند متعال کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا ہے کہ اس کے ترک کرنے سے خدا کو کوئی نقصان پہنچے گا۔ بلکہ عبادت کو ترک کرنے سے خود بندہ اس کے بلند نتائج سے محروم ہوتا ہے۔

بظاہر یہ شبہ بعض ملائکہ کے لئے بھی پیش آیا ہے، کیونکہ جب خداوند متعال نے ان کے لئے اعلان فرمایا کہ: میں زمین میں اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں اور انہوں نے کہا کہ کیا اسے بنائے گا جو زمین میں فساد برپا کرے اور خونریزی کرے، جبکہ ہم تیری تسبیح و تقدیس کرتے ہیں تو ارشاد ہوا کہ میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ہو، اور خدا نے آدم کو تمام آسماء کی تعلیم دی اور پھر ان سب کو ملائکہ کے سامنے پیش کر کے فرمایا کہ ذرا تم ان سب کے نام تو بتاؤ اگر تم اپنے خیالی استحقاق میں سچے ہو، ملائکہ نے عرض کی ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں جتنا

تو نے ہمیں بتایا ہے کہ تو صاحب علم بھی ہے اور صاحب حکمت بھی ...پھر اپنی بے بسی کا اعتراف کرتے ہوئے ملائکہ نے آدم کے لئے سجدہ کیا[4] یہ امر اپنی جگہ پر مسلم ہے کہ جانی بوجھی و یا اختیاری عبادت، تکوینی اور اجباری عبادت سے زیادہ قدر و منزلت رکھتی ہے، لہٰذا اختیاری عبادت کا اثر ہے اور غیر اختیاری عبادت کا کوئی اثر نہیں ہے، اختیاری عبادت بالقوہ موجود کو بالفعل میں تبدیل کرتی ہے لیکن غیر اختیاری عبادت کی فعلیت کا نتیجہ ثابت ہے اس میں کمال وارتقا کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور اگر نافرمانی کرے تو زوال سے دوچار ہوتا ہے!

امام علی علیہ السلام، ملائکہ کی یوں توصیف فرماتے ہیں:

تو نے ملائکہ کو پیدا کر کے انہیں آسمانوں میں جگہ دی۔ ان کے لئے تھکن، غفلت اور معصیت نہیں ہے۔ وہ تیرے سب سے اعلم بندے ہیں اور تمام مخلوقات میں سے تجھ سے خائف تر ہیں اور سب تیرے لئے نزدیک تر ہیں اور سب سے زیادہ تیرے مطیع ہیں۔ان پر نیند طاری نہیں ہوتی ہے... ان کی عقل غلطی نہیں کرتی ہے اور ان کا بدن تھکن محسوس نہیں کرتا ہے۔ اصلاب میں قرار نہیں پاتے ہیں اور ارحام میں مخفی نہیں ہوتے اور وہ نجس پانی (منی) سے پیدا نہیں کئے گئے ہیں۔ انہیں تو نے ایک خاص طریقہ سے پیدا کیا ہے اور اپنے آسمانوں میں جگہ دی ہے اور اپنے جوار میں انہیں کرامت بخشی ہے اور انہیں اپنی وحی کا امین بنایا ہے اور انہیں آفات و بلیات سے محفوظ رکھا ہے اور انہیں گناہوں سے پاک کیا ہے۔ اگر تو انہیں طاقت نہ بخشتا تو وہ کوئی طاقت نہیں رکھتے، اگر تو انہیں مستحکم نہ بناتا تو وہ مستحکم نہ ہوتے۔ اگر ان پر تیری رحمت نہ ہوتی تو وہ اطاعت نہ کرتے اور تو نہ ہوتا تو وہ بھی نہ ہوتے۔ اس کے باوجود تیرے نزدیک ان کی منزلت تیرے لئے ان کی عبادت، تجھ سے ان کا تقرب اور تیرے اوامر سے ان کی عدم غفلت، تیری ہی عنایت ہے۔ اگر تو اپنی ذات کے بارے میں مخفی رکھی چیز کو بھی ان کے سامنے ظاہر کرتا، تو بیشک ان کے اعمال اس کی نظر میں حقیر تر بن

جاتے اور وہ شرمندہ ہوتے اور جانتے کہ انہوں نے تیری شایاں شان عبادت و بندگی نہیں کی ہے ۔تو خالق و معبود ہو اور تسبیح تیرے لئے ہے، تو اپنے بندوں کی عجیب آزمائش کرتا ہے۔[5]

اگر امیر المومنین علیہ السلام کی مذکورہ عبارت پر غور کیا جائے تو: ۱۔ ان کی عبادتوں کا راز ۲ ان کے اس اعتراض کا راز ۳۔ ان کے اعتراف کر کے سجدہ کرنے کا راز بھی واضح ہوتا ہے۔ ان کی عبادتیں ذات حق تعالے کے بارے میں ان کے علم شہودی کے اقتضاء اور ان کا خوف وخشیت حق تعالیٰ کی ہیبت وعظمت سے اعزاز پاتا ہے ۔ البتہ یہ علم ان کے محدود وجود کے تناسب سے انہیں حاصل ہے اور ان کی عبادت بھی ان کی محدود ذات کے متناسب ہے نہ کہ خداوند متعال کی ذات اقدس کے متناسب۔

حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کئے جانے کے وقت ان کا اعتراض ان کے علم کی محدودیت کی وجہ سے تھا اور جب یہ امر ان کے لئے واضح اور روشن ہوا تو اپنے عجز و ناچارگی سے آگاہ ہو گئے اور اپنی جہالت وخطا کا اعتراف کر کے، خدا کے حکم سے آدم علیہ السلام کے لئے سجدہ کیا۔

خلاصہ یہ کہ ملائکہ کی اختیاری عبادت، انسانوں میں تشریع و تکلیف کے معیار کے مانند نہیں ہے۔ لہٰذا یہ عبادت ان کی ترقی، بلندی، ارتقاع اور رشد کا سبب نہی بنتی ہے ۔ بلکہ اگر وہ اس عبادت کو چھوڑ دیں اور خطا کریں تو زوال سے دوچار ہوتے ہیں۔

پس ان کی عبادت کا سرچشمہ ایک طرف ذات اقدس الٰہی کی نسبت ان کا علم اور ہیبت وعظمت کا ادراک کرنا ہے اور دوسری طرف سے ان کے وجود کی حقارت اور محدودیت ہے، چنانچہ یہ امر انسان کی فطرت میں بھی مضمر ہے۔ لیکن ملائکہ کی تکوینی اور اجباری نیاز مندی کا بھی خداوند متعال کو کوئی فائدہ نہیں ہے اور پروردگار عالم کو ان کا اور ان کی عبادت کی

کوئی احتیاج نہیں ہے بلکہ یہ سب خالق، قادر، حکیم اور عالم کی قدرت کی جلوہ نمائی ہے۔

منابع وماخذ:

١۔قرآن کریم، فاطر، ١، صافات، ١٦٤، تکویر ٢١، سجدہ، ٥ و ١٢، انعام، ٦٢، نحل، ٢ و١٠٢، بقرہ، ٩٧، عبس، ١٦، معارج، ٤ حجر، ٢١، حج، ٢٢، نازعات، ٥، تحریم، ٦، ذاریات، ٤، مؤمن، ٧، نجم، ٢٦، انبیاء، ٢٨ و ١٠٣، بقرہ ١٦١ و ٣٣۔ ٣٠ و ٢٤٨، آل عمران، ٣٩ و ١٢٥۔ ١٢٤، تحریم، ٤، مریم، ٧ و ١٩۔ ١٦، زمر، ٧٣، مدثر، ٣٠، زخرف، ٧٧۔

٢۔طباطبائی، محمد حسین، المیز ان، دفتر انتشارات جامعہ مدرسین، قم، ص ١٣۔ ٥۔

٣۔ مصباح یزدی، محمد تقی، معارف قرآن، ٣۔١، در راہ حق، طبع ١٣٦٨، ٢، قم، ص ٢٩٥۔ ٢٨٣۔

حواشی

[1] مریم، ١٩۔١٦.

[2] ہود، ٧٧۔ ٦٩.

[3] ہود، ٨١.

[4]۔سورہ بقرہ، ٣٣۔ ٣٠۔

[5]۔ ملاحظ ہو: المیز ان، ج ١٧، ص ١٠۔ ٨۔

یہ جو بعض اولیائے الٰہی ''ما کان وما یکون وما ھو کائن'' (ماضی، حال اور مستقبل) کا علم رکھتے تھے، اس سے کیا مراد کیا ہے؟

مختصر جواب

انسان کو مختلف طریقوں سے معلومات حاصل ہوتے ہیں، ان طریقوں میں سے ایک غیب سے رابطہ ہے، خود اس کی بھی مختلف قسمیں ہیں اور انسان کا غیب سے رابطہ خود اس کی روحانی، نفسیاتی اور عقلی وسعت اور اس کے حق تعالٰی کے منبع فیض سے روابط کے نسبت سے متفاوت ہے اور غیب سے یہ رابطہ کسی کے لئے وسیع اور کسی کے لئے تنگ ہوتا ہے۔

مختلف انسان خود کو تحصیل علم کی عادی اور فطری راہوں کے ڈھانچے میں محدود کرتے ہیں، لہٰذا ان کے معلومات بھی عام طور پر حال سے محدود ہوتے ہیں اور ماضی کے بارے میں ان کا علم، تاریخی اسناد اور آثار قدیمہ کی کوششوں سے وابستہ ہوتا ہے اور ان کا مستقبل کے بارے میں علم پیشنگوئیوں کے علاوہ حال سے ربط نہیں رکھتا ہے۔ لیکن وہ انسان جو فطری اور مادی قید و بند سے اپنے آپ کو آزاد کرتے ہیں اور اپنے وجود میں وسعت پا کر عالم ماورائے طبیعت سے رابطہ برقرار کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں، وہ ماضی، حال اور

مستقبل کے بارے میں گہرے، بے خطا اور وسیع تر اطلاعات حاصل کر سکتے ہیں اولیائے الٰہی اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کی معلومات مختلف صورتوں میں، جیسے وحی، قلبی الہام، سچے خواب، کشف وشہود، سیر وسلوک سے حاصل ہوتی ہیں ۔ اور کبھی یہ معلومات وراثت یا خاص رابطہ یا علم جفر کے ذریعہ اس کی صلاحیت رکھنے والوں کو حاصل ہوتی ہیں ۔

تفصیلی جواب

انسان کی اس طرح تخلیق ہوئی ہے کہ وہ مختلف طریقوں سے معلومات کو حاصل کر سکتا ہے، من جملہ مندرجہ ذیل راہوں سے:

۱۔ رجحانات، غرائز اور شہوانی خواہشات: یہ راہ انسان کو اس کی فطری اور جسمانی ضرورتوں سے آگاہ کرتی ہے ۔ جیسے بھوک، پیاس اور احساس درد وغیرہ کا علم ...

۲۔ فطرت: فطرت اسے بلند تقاضوں سے مطلع کرتی ہے اور اس کی طرف کھینچ لیتی ہے، جیسے: ایک برتر موجود (حس مذہبی و پرستش) سے وابستگی اور دل لگی کی حس، حقیقت کی تلاش اور کمال حاصل کرنے اور زیبائی طلبی کی حس و...

۳۔ عقل سلیم: عقل سلیم انسان کو ابتدائی بدیہیات سے آگاہ کرتی ہے، جیسے: اجتماع کا استحالہ یا نقیضین، اصغریت، اکبریت، تساوی اور تشابہ کو رفع کرنا و... انسان ان ابتدائی بدیہیات کو بنیاد قرار دیتا ہے اور ان کے ذریعہ استدلال برہان اور استنتاج تک پہنچتا ہے اور جدید معلومات حاصل کرتا ہے۔

٤۔ حواس خمسہ (پنجگانہ): حواس پنجگانہ انسان کے جسمانی رابطہ کے اپنے جسم سے اور اپنے اردگرد کے ماحول سے رابطہ کسی صنعتی اوزار کے بغیر رابطہ قائم کرنے کے وسیلے ہیں ۔ انسان کو اکثر معلومات اس طریقہ سے حاصل ہوتی ہیں، یہاں تک کہ بعض لوگ دوسرے تمام طریقوں کو جھٹلا کر معلومات حاصل کرنے کے صرف اسی طریقہ کا اعتقاد رکھتے

ہیں اور انہیں حس گرایان یا حسیوں یا تجربیون کہا جاتا ہے۔

۵۔ وراثت: بعض معلومات، وراثت کی صورت میں، خاص جین (Gene) کے ذریعہ انسان میں منتقل ہوتے ہیں اور مخفی حالت میں رہتے ہیں اور ضرورت کے وقت نمودار ہوتے ہیں، چنانچہ انسان کے بعض حالات وصفات بھی ایسے ہی ہوتے ہیں۔

٦۔ جادو، ستاروں کی حرکت، سحر، جنات سے رابطہ قائم کر کے، ہپناٹیزم اور خواب اور اس کی تعبیر سے بعض اطلاعات کو حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اگر چہ یہ طریقہ کسی حد تک غیر فطری اور خلاف عادت ہے، لیکن اکثر دنیوی امور سے مربوط ہے۔

معلومات حاصل کرنے کے مذکورہ طریقے انسانوں کے درمیان مشترک و قابل تعلیم و تعلم اور منتقل ہیں اور ماہرین نفسیات، معرفت شناس اور فلاسفہ نے انہیں دوحصوں، یعنی کلی اور حصولی میں تقسیم کیا ہے۔ ان کی تفصیلات اپنی جگہ پر بیان ہوئی ہیں اور اس مقالہ میں اس کی بحث کو چھیڑنے کی گنجائش نہیں ہے۔

۷۔ الٰہی لوگ، معلومات حاصل کرنے کے ایک اور طریقہ کے معتقد ہیں، اس کا نام غیب سے ارتباط ہے۔ لیکن مادہ پرست اور صرف حس کے حامی، غیب اور ماورائے فطرت عالموں کے منکر ہیں اس لئے معلومات حاصل کرنے کے اس طریقہ کے سخت مخالف اور منکر ہیں اس راہ کا اعتقاد رکھنے والوں اور دعویٰ کرنے والوں پر سحر و جادو اور پاگل پن کا الزام لگاتے ہیں۔ اس اہم طریقہ کے اثبات و انکار کا مسئلہ تاریخ میں ایک اہم تنازعہ کی صورت میں موجود تھا ایک طرف رسالت و نبوت کے مدعی اور دوسری طرف ان کے دشمن اور ضدی افراد اس سلسلہ میں لڑتے رہے ہیں اور یہ مسئلہ عہد صنعت اور علم وتمدن سے مخصوص نہیں ہے[1]

اسلامی محققین کے مطابق خود یہ راہ بھی مختلف طریقوں سے حاصل کی جاسکتی ہے:

۱) قلبی الہامات سے، جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو الہام ہوا تا کہ (بچہ) حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایک صندوق میں رکھ کر دریائے نیل میں ڈال دیں اور خداوند متعال پر بھروسا کریں تا کہ خداوند متعال حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دوبارہ اپنی ماں کے پاس لوٹا کر اسے رسول کے عنوان سے مبعوث فرمائے۔[2]

۲) سچے خواب: چنانچہ حضرت ابراہیمؑ علیہ السلام کے بارے میں ان کے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کرنے کے لئے فرماتا ہے: ابراہیمؑ نے اسماعیلؑ سے کہا: بیٹے! میں نے خواب میں دیکھا کہ تجھے ذبح کر رہا ہوں، تیری رائے کیا ہے؟ اس نے کہا: بابا! جو کچھ آپ پر حکم ہوا ہے، اسے انجام دیجئے، خدا نے چاہا تو آپ مجھے صابرین میں پائیں گے![3] اس کے علاوہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خواب میں مستقبل میں فتح مکہ کی اطلاع ملنا۔[4]

۳) وحی: خود وحی بھی چار صورتوں میں حاصل ہوتی ہے:

الف: بلا واسطہ صورت میں کلام الٰہی، مخاطب کے قلب یا سماعت میں داخل ہوتا ہے۔

ب: ایک فرشتہ حقیقت میں ظاہر ہو کر مخاطب کو وحی پہنچاتا ہے۔

ج: مخاطب، فرشتہ کی صرف آواز سنتا ہے اور پیغام کو حاصل کرتا ہے، لیکن اسے نہیں دیکھتا ہے۔

د: فرشتہ انسان کی شکل میں ظاہر ہو کر پیغام کو مخاطب تک پہنچاتا ہے۔[5] لیکن قابل توجہ بات ہے کہ مذکورہ روابط کے لئے مخاطب کے نبی یا امام ہونے کی شرط نہیں ہے، اگر چہ کسی رسول یا امام کا اس رابطہ کے بغیر تصور نہیں کیا جاسکتا ہے، دوسرے الفاظ میں تمام انبیاء و اوصیاء کسی نہ کسی طرح مذکورہ رابطہ رکھتے تھے، بلکہ ان میں سے، مانند پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مختلف زمانوں میں مذکورہ تمام روشوں سے بہرہ مند ہوئے ہیں۔ لیکن ایسا نہیں

ہے کہ جو بھی اس قسم کا رابطہ رکھتا ہو، وہ نبی یا وصی ہوگا۔ پس نبی اور امام کی نبوت اور امامت، دوسرے طریقوں سے ثابت ہونی چاہئے، جیسے: نبوت و امامت کا دعویٰ کرنا، معجزات دکھانا، پہلے نبی کی بشارت، اپنے بعد والے وصی کی بشارت (نص) اور دوسرے تمام دلائل وشواہد۔ [6] اس لحاظ سے اگرچہ حضرت زہراءؑ اور حضرت مریم علیہما السلام و ... حضرت جبرئیل کے مخاطب قرار پائے، لیکن نبی یا امام نہیں ہیں۔

٤۔ ماورائے فطرت کے عالموں کی سیر، مکاشفہ یا مکمل بیداری و ہوشیاری میں یہ سفر انجام پانا، جیسے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معراج۔ [7]

٥۔ ایسے اسناد کی طرف رجوع کرنا، جو ان کے اہل کے پاس ہوں، جیسے قرآن مجید کے باطن کا علم اور معصومینؑ کے توسط سے اس کی آیات کی تاویلات اور تفسیر اور امام علی علیہ السلام کے توسط سے جفر جامع کو دوسرے ائمہ میں منتقل کرنا۔

٦۔ اولیائے الٰہی کے لعاب دہن یا جھوٹے کھانے کے ذریعہ معلومات کا منتقل ہونا یا اولیائے الٰہی کے دم مسیحائی سے بہرہ مند ہونا، جیسے کربلائی کاظم ساروقی سے ظاہر ہوئی کرامت اور ان پڑھ محض ہونے کے باوجود ایک ہی نظر عنایت سے ان کا حافظ کل قرآن بن جانا۔ [8]

مذکورہ مطالب کی تفصیلات معارف اور نبوت ووحی کی بحث سے متعلق اکثر کتابوں میں درج ہیں ۔ اس کے علاوہ بعض اولیائے الٰہی اور علمائے دین کے مکاشفات کو تاریخ اور سیرت کی کتابوں میں مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ لیکن جفر جامع کے بارے میں ہم ذیل میں ایک مختصر وضاحت پیش کرتے ہیں:

امام علی علیہ السلام، نہج البلاغہ کے خطبہ نمبر ٩٣ میں تشریح فرماتے ہیں کہ: میں بچپن سے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ساتھ تھا، سوائے اس کے کہ کبھی خاص ماموریت پر چلا جاتا،

میں کبھی رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جدا نہیں ہوتا تھا اور مسلسل آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم و تربیت کے سائے میں رہتا تھا۔ امامؑ اپنے علم غیب کے بارے میں فرماتے ہیں: پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے اپنی آغوش میں لے کر اپنے بدن سے چپکایا اور اپنی زبان مبارک میرے منہ میں ڈال دی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لعاب دھن سے میرے لئے علم کے ہزار باب کھل گئے کہ ہر باب سے مزید ہزار باب کھلتے ہیں۔[9]

ابو حامد غزالی نے لکھا ہے کہ: امام المتقین علی بن ابیطالب علیہ السلام کے پاس ایک کتاب ہے۔ اس کتاب کا نام جعفر جامع الدنیا والآخرہ ہے۔ اور اس کتاب میں تمام علوم، حقائق، اسرار، علم غیب، کائنات میں موجود اشیاء کی خصوصیت و اثرات، اسماء و حروف کی خصوصیات وغیرہ درج ہیں جو آپؑ کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے امامت وولایت کے مقام پر منصوص، آپؑ کے گیارہ فرزندوں کو وراثت میں ملے ہیں۔ ان غیبی علوم کے بارے میں مذکورہ مقدس ذوات مقدس کے علاوہ کوئی آگاہ نہیں ہے[10]

اس کتاب میں ماضی، حال اور قیامت تک مستقبل کے بارے میں ہر ایک چیز لکھی گئی ہے، حتی کہ اپنی اولاد و ذریات اور ان کے دوستوں اور دشمنوں کے نام تک اس میں درج ہیں اور جو کچھ ان پر قیامت تک گزرے گی وہ بھی اس کتاب میں درج ہے... یہ جفر جامع نامی کتاب رمزی حروف میں لکھی گئی ہے اور اس کے رمز کو سمجھنے کی کلید وراثت کے طور پر ائمہ اطہار علیہم السلام کے سپرد کی گئی ہے اور ان کے علاوہ کوئی شخص ان رموز کو سمجھنے کی قدرت نہیں رکھتا... اکثر واقعات اور قضایا جن کے بارے میں ائمہ اطہار علیہم السلام خبر دیتے تھے، اسی کتاب میں سے نکالتے تھے۔ وہ امور کے بارے میں کلیات سے لے کر جزئیات تک سے باخبر تھے۔ خود اہل بیتؑ پر اور شیعوں پر وارد ہونے والی مصیبتوں اور مشکلات کو اسی کتاب سے نکالتے تھے، جیسا کہ احادیث کی کتابوں میں مکمل اور وسیع پیمانے پر درج ہوا ہے...[11]

یہ جفر، بکری کی کھال تھی، جو جبرئیل کے حکم سے ذبح کی گئی تھی پھر اس کی کھال کو دباغت کے ذریعہ تیار کیا گیا تھا [12]، پس غیب کی خبریں جبرئیل نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی علیہ السلام کو املا کی صورت میں بتائی ہیں اور حضرت علی علیہ السلام نے انہیں اس قدر لکھا ہے کہ یہ پوری کھال حتی کہ اس کے دست و پا بھی پر ہو گئے اور اس میں ماضی اور مستقبل کی تمام خبریں درج کی گئی ہیں اور یہ کھال وراثت کے طور پر ائمہ اطہار علیہم السلام کو منتقل ہوئی ہے ۔ البتہ ائمہ اطہار علیہم السلام کا علم صرف اسی جفر جامع سے استفادہ کرنے تک محدود نہیں تھا بلکہ یہ لوگ (ائمہ اطہار) غیبی الہامات سے بہرہ مند اور مکاشفات اور عالم ملکوت سے رابطہ رکھنے کے مالک تھے، چنانچہ امام حسین علیہ السلام کے کربلا کی طرف سفر کے دوران مختلف منازل اور کربلا میں اس کا مشاہدہ کیا گیا ہے۔اسی طرح یہ لوگ، سچے خوابوں سے بھی خبریں اور حوادث کے بارے میں قبل از وقوع باخبر ہوتے تھے اور مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کے بارے میں اس طرح خبر دیتے تھے کہ واضح اور روز روشن ان کے سامنے واقع ہوئے ہوں۔قرآن مجید کی جو آیات غیب کو خداوند متعال سے مخصوص جانتی ہیں یا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں علم غیب کی نفی کرتی ہیں، وہ مذکورہ مطالب سے منافات نہیں رکھتی ہیں،[13] کیونکہ اس قسم کی آیات کی خود دوسری آیات سے تخصیص کی گئی ہے جو اس پر دلالت کرتی ہیں کہ خداوند متعال نے خود اپنے بعض بندوں کو کسی حد تک غیب سے آگاہ کیا ہے۔[14]

دوسرے الفاظ میں، خداوند متعال کا عالم غیب کے بارے میں علم، ایک ذاتی و ازلی علم ہے ۔لیکن غیب کے بارے میں اولیائے الٰہی کا علم (جو تھا، ہے اور ہوگا) عرضی اور حصولی (خدا سے حاصل کیا گیا) علم ہے اور خدا کے اذن واجازت سے حاصل کیا گیا ہے اور اسی مقدار تک محدود ہے جس سے خدا نے انہیں مطلع فرمایا ہے، اس سے زیادہ نہیں۔

دوسری جانب یہ غیبی علم اس معنی میں نہیں ہے، کہ ان سے کوئی چیز مخفی نہ ہو، مثال

کے طور پر تبوک کے سفر میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اونٹ گم ہو گیا اور اس کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملی، کسی نے طعنہ دیتے ہوئے کہا کہ: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیسے پیغمبر ہیں کہ اپنے اونٹ کے بارے میں بھی خبر نہیں رکھتے ہیں؟ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: خدا کی قسم میں نہیں جانتا ہوں، مگر یہ کہ خداوند متعال مجھے تعلیم دے اور اس وقت مجھے خداوند متعال نے خبر دی ہے کہ یہ اونٹ فلاں جگہ پر ناک کی نکیل ایک درخت سے پھنسنے کی وجہ سے بند ہو گیا ہے، جا کر اسے لے آیئے۔[15] چنانچہ ایسا ہی واقعہ حضرت امام صادق علیہ السلام اور آپؑ کی کنیز کے بارے میں بھی پیش آیا ہے۔[16]

خلاصہ یہ کہ جو کچھ واقع ہوا ہے، ہو رہا ہے اور مستقبل میں واقع ہونے کے بارے میں اولیائے الٰہی کا علم، عالم غیب (ماورائے فطرت) سے رابطہ برقرار ہونے کے نتیجہ میں ہوتا ہے اور یہ عام طریقہ کے ادراک سے بالاتر ہے.لیکن اس عالم غیب سے رابطہ کی بذات خود مختلف صورتیں ہیں .بعض افراد کے لئے یہ تمام موارد جمع ہوتے ہیں اور مختلف زمان و مکان میں ان سے بہرہ مند ہوتے ہیں اور بعض لوگوں کے لئے ممکن ہے، ان صورتوں میں سے صرف ایک صورت میسر ہو۔اہم یہ ہے کہ ان صورتوں کا حاصل ہونا اور ان کے درمیان فرق، افراد کے صفائے قلب اور روحانی توانائی سے نسبت رکھنے سے مربوط ہے.

یہ امر حد درجہ اہمیت والا ہے کہ عالم ہستی کے مقدرات اور حوادث (دنیا و آخرت میں) ان کی پیدائش سے پہلے ضبط و تحریر ہو چکے ہیں اور انسان کے اختیارات کو سلب کئے بغیر، پورے عالم ہستی، من جملہ انسان پر حاکم ہیں اور دنیا کی نابودی کے بعد بھی وہ حوادث، مضبوط اور مشخص صورت میں، باقی ہیں اور ہر انسان سے متعلق اس کے امور کو نامہ عمل کی صورت میں اس کے حوالہ کیا جائے گا.اس مطلب کے پیش نظر غیب سے رابطہ اور ماضی، حال اور مستقبل کے بارے میں گہری اطلاع نے معنی پائے ہیں اور اس کے بارے میں تصور کیا

جاسکتا ہے.[17]

منابع وماخذ:

۱۔ بی ریا، ناصر، روانشناسی رشد، ج۱، سمت (دفتر ہمکاری)، چاپ۱، ۱۳۷۵، تہران.

۲۔ جوادی آملی، عبداللہ، تحریر القواعد، الزہرا، چاپ ۱۳۷۵، تہران.

۳۔ جوادی آملی، عبداللہ، حیات عارفانہ ی امام علی علیہ السلام، اسرا، چاپ ۱، ۱۳۸۰، قم.

٤۔ جوادی آملی، عبداللہ، فطرت در قرآن، اسرا، چاپ ۲، ۱۳۷۹، قم.

٥۔ جوادی آملی، عبداللہ، معرفت شناسی در قرآن، اسرا، چاپ ۲، ۱۳۷۹، قم.

٦۔ حسینی، نعمت اللہ، مردان علم در میدان عمل، دفتر نشر اسلامی، ۱۳۷۵، قم.

۷۔ سبحانی، جعفر، فراز ہائی از تاریخ اسلام، مشعر، طبع ۲، ۱۳۸۱، تہران.

۸۔ سلطان الواعظین، شیرازی، شبہای پیشاور، ص۹٤۰۔۸٦۱، دار الکتب الاسلامیہ، چاپ ٤، ۱۳۷۸ ہ.ق، تہران.

۹۔ کیا شمشکی، ابو الفضل، ولایت در عرفان، دار الصادقین، چاپ۱، ۱۳۷۸، تہران.

۱۰۔ مصباح یزدی، محمد تقی، آموزش عقاید، ج۱۔۲، سازمان تبلیغات اسلامی، چاپ٦، ۱۳۷۰، قم.

۱۱۔ مصباح یزدی، محمد تقی، معارف قرآن، ج٤۔٥، موسسہ آموزشی و پژوہشی امام خمینی (رہ)، چاپ۱، ۱۳۷٦، قم.

حواشی

[1]۔ قصص۔۷، طہ، ٤۰۔۳۷۔

[2]۔ ذاریات۔٥۲، حجر، ۱٥۔۱۰۔

[3]۔صافات،١٠٦-١٠٢۔

[4]۔فتح۔٢٧۔

[5]۔شوری،٥٢۔٥١۔

[6]۔ملاحظہ ہو: سبحانی،جعفر، الالہیات، ج ٣،ص ٦٥ و ٢١٨۔

[7]۔اسراء،٢۔١، ملاحظہ ہو: تفاسیر ذیل این آیہ کریمہ۔

[8]۔ملاحظہ ہو: محمدی ری شہری، محمد، کربلائی کاظم، مؤسسہ درراہ حق۔

[9]۔ملاحظ ہو: شیرازی، سلطان الواعظین، شبہای پیشاور،، ص ٩٢٧۔٨٦١۔

[10]۔ملاحظہ ہو: شیرازی، سلطان الواعظین، شبہای پیشاور، ص ٩٣١۔٩٢٨۔

[11]۔ایضا۔

[12]۔ایضا، ص ٩٣٦۔٩٣١۔

[13]۔انعام،، ٥٠ و ٥٩، کہف،، ١١٠، اعراف، ١٨٨، ہود، ٣٣، نمل، ٦٦، آل عمران، ١٧٤ و...

[14]۔کہف، ٦٤، جن، ٢٦، آل عمران، ٤٣ و ١٧٤، ہود، ٥١، شوری، ٥٣۔

[15]۔سبحانی، جعفر، تاریخ پیامبر اسلام، ص ٤٨٠۔

[16]۔اصول کافی، ج١، ص ٢٥٧، ملاحظہ ہو: آموزش عقاید، درس ٣٩، ص ٣٧٤۔٣٦٨۔

[17] ر،ک: نمایہ ی، رطب و یابس و کتاب مبین در قرآن، سوال ١٨٧.

سورہ آل عمران کی آیت ۱۹ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ قف میں اسلام کو کبھی خدا کے برابر تسلیم کے معنی میں تاویل کر کے اسے اسم مصدر جانتے ہیں، مہر بانی کر کے اس سلسلہ میں وضاحت فرمایئے۔

مختصر جواب

لغت میں اسلام خداوند متعال کے سامنے کسی چون و چرا کے بغیر تسلیم محض ہونے کے معنی میں ہے۔ اور دین، انسان کے انفرادی اور اجتماعی امور میں افکار، حالات و کرداراور اس کے اپنے آپ، دوسروں اور خدا وند متعال سے رابطہ کے طریق کار کے سلسلہ میں خداوند متعال کے اس سے توقعات کے معنی میں ہے۔ اس لئے ہر دین کو قبول کرنے کا لازمہ یہ ہے کہ انسان ہر عصر میں اسی زمانہ کے پیغمبر کے لائے ہوئے دین کے سامنے چون و چرا کے بغیر تسلیم محض ہوجائے۔ نئے دین کے آنے سے (جو نئے حکم کے مانند ہے) خدا کے بندے اس امر کے ذمہ دار ہیں کہ اسی پہلے والے دین کی ہدایت کے مطابق، نئے دین کو قبول کریں اور اس کے سامنے سراپا تسلیم ہوجائیں۔ پس یہ کہا جاسکتا ہے کہ، بشریت کی پوری تاریخ کے دوران، تمام انبیائے الٰہی صرف ایک دین، یعنی دین اسلام کے مبلغ تھے اور سابق و ملحقہ

انبیاء کی شریعتوں میں کمی بیشی کے لحاظ سے تفاوت بھی پایا جاتا ہے لیکن اس جہت سے خود انبیاء میں کوئی فرق نہیں ہے اگر چہ وہ سب فضیلت اور خدا کے پاس مقام ومنزلت کے لحاظ سے یکساں نہیں ہیں۔[i] اور نئی شریعت کے آنے کے بعد پہلی والی شریعت پر باقی نہیں رہا جاسکتا ہے۔ مذکورہ مطالب کے پیش نظر جب انبیاء علیہم السلام اور ان کی شریعتیں، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دین اسلام کے آنے کے بعد ختم ہوگئیں اور یہ دین، ایک آفاقی اور لافانی دین ہے، اگر کوئی شخص حقیقت میں اپنے آپ کو دیندار اور خداوند متعال کا مطیع وتسلیم محض جانتا ہے، خواہ یہودی، نصاری اور مشرکین وغیرہ ہوں، اس کے لئے حقیقی دین محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قبول کرنا ضروری ہے تا کہ اس کا دین خدا کی مرضی کے مطابق ہو اور اسے قبول کیا جائے اور وہ اپنے افکار وحالات اور نیک کردار کے مسابقہ میں شرکت کر کے بہشت کے درجات پر فائز ہو جائے ! اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت اور دین اسلام کے مکمل ہونے کے بعد کوئی دوسرا دین قابل اجر وقبول نہیں ہوگا۔

[i]۔سورہ اسراء، ۵۵ سورہ بقرہ، ۲۵۳۔

تفصیلی جواب

خداوند متعال کے حضور سراپا تسلیم ہونے کے مختلف مراتب ودرجات ہیں:

۱۔ خداوند متعال کے سامنے تمام مخلوقات من جملہ انسان کا تکوینی طور پر تسلیم محض ہونا: یہ اس معنی میں ہے کہ ان مخلوقات کی تکوینی تخلیق، تبدیلیاں اور تغیرات اور ان کی کیفیت و جنسیت اور بالاخر ان کی موت میں سے کوئی چیز ان کے اختیار میں نہیں دی گئی ہے اور سب مخلوقات جبری طور پر اللہ کی معین کردہ تقدیر، تخلیق، تدبیر اور ملک و ربوبیت کے سامنے تسلیم محض ہیں۔[1] اس معنی میں حتی کہ دشمن، مشرکین، کفار اور منافقین بھی اس تکوین میں تسلیم محض خداوند متعال ہیں اور اس میں کسی قسم کی نافرمانی نہیں کر سکتے ہیں، خواہ وہ چاہیں یا نہ

چاہیں اور جان لیں یا نہ جان لیں۔[2]

۲۔ اسلام، اس معنی میں ہے کہ اگر انسان کی فطرت غلط تعلیم وتربیت کے تحت قرار نہ پائے تو وہ خدا طلب ہے اور اپنے پروردگار، رزاق اور مالک مطلق کے سامنے مخلص، تابعدار اور تسلیم محض ہے اور فطری طور پر توحید کا رجحان رکھتا ہے اور انحراف وشرک سے دوری اختیار کرتا ہے۔ یہی باطنی اسلام ابراہیمؑ علیہ السلام کو ملکوت اعلی تک پہنچاتا ہے اور جان ودل سے ندا دیتا ہے کہ: میرا رخ تمام تر اس خدا کی طرف ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے[3]

۳۔ اسلام، یعنی، کسی چون و چرا کے بغیر اور خدا کے عرفانی، علمی و اخلاقی تعلیمات کے درمیان کسی قسم کے امتیاز، یعنی بعض پر عمل اور بعض کو ترک کئے بغیر، دین کے سامنے سراپا تسلیم ہونا ہے۔ دوسرے الفاظ میں انسان کے افکار، حالات اور رفتار کے سلسلہ میں خداوند متعال کی طرف سے تشریعی امر ونہی کا نام دین ہے۔

یہ تسلیم ہر قسم کی دینداری کے ادعا کا لازمہ ہے۔ یعنی اگر کوئی شخص حقیقت میں اپنے آپ کو متدین اور دین الہی کا پابند جانتا ہو، تو اسے خداوند متعال کے اوامر ونواہی کے مقابل میں تسلیم محض ہونا چاہئے، خواہ وہ اس کی مرضی اور خواہشات کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں۔[4]

اس لئے اگر اس کا محبوب پیغمبر سفارش اور تاکید کرے کہ ایک مدت کے بعد میری شریعت کو چھوڑ کر نئے پیغمبر اور اس کی شریعت کی پیروی کرنی چاہئے، تو اگر وہ حقیقت میں اپنے پیغمبر کا پیرو، مطیع اور فرمانبردار ہے، تو بعد والے پیغمبر کے مبعوث ہونے کے بعد اس پر فرض عائد ہوتا ہے کہ پہلی شریعت کو چھوڑ کر نئی شریعت کے مطابق عمل کرے۔ چنانچہ اگر یہودی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حقیقی پیروکار ہوتے، تو انہیں حضرت عیسی علیہ السلام کی بعثت کے بعد

ان کا پیرو کار بننا چاہئے تھا اور اس وقت یہودی نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہتی۔ اسی طرح اگر عیسائی حضرت مسیح علیہ السلام کے حقیقی پیرو ہوتے تو انہیں حضرت مسیح علیہ السلام کے حکم کے مطابق، حضرت محمد بن عبداللہ (علیہ وآلہ افضل التحیات والصلوات والسلام) کی بعثت کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پیرو کار بن کر پچھلے دین کو چھوڑ کر مسلمان بننا چاہئے تھا!

٤۔ اسلام، خدا کا آخری اور مکمل ترین دین ہے جو اپنے سے پہلے تمام شریعتوں کو منسوخ کرنے والا دین ہے اور اس کے بعد کوئی ایسی شریعت نہیں آئے گی جو اس شریعت کو منسوخ کر سکے۔[5] اس لئے، رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبعوث ہونے کے بعد اور اس دین کے مکمل اور تمام ہونے کے بعد کوئی دین قابل قبول نہیں ہوگا، اور اس دین کے بعد کوئی شریعت خدا کی پسندیدہ شریعت نہیں ہے۔

کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین پر ایمان لانے اور اس دین کے مقابل میں تسلیم محض ہونے کا لازمہ تمام انبیاء کی شریعتوں پر ایمان اور ان کی تصدیق کرنے کے مترادف ہے اور اس کے علاوہ ان جدید اور مطابق وقت (احکام و معارف) کے اتمام و اکمال کو قبول کرنا ہے۔ لیکن دوسری شریعتوں کا ایمان ایک ایسے دین پر ایمان ہے جن کے ذریعہ مکمل طور پر دنیا و آخرت کی سعادت حاصل کرنے کے لئے انسان کی ضرورتوں کو پورا نہیں کیا جا سکتا ہے، اس لحاظ سے یہ شریعتیں ناقص اور نارسا ہیں۔ لہٰذا اس کے بعد یہ ادیان بہ رضائے حق واقع نہیں ہو سکتے ہیں اور ان کو قبول کرنے والے ثواب و اجر کے مستحق نہیں ہو سکتے ہیں! خاص کر جب وہ ادیان تحریف زدہ ہو کر اپنی الٰہی راہ سے دور ہو چکے ہیں۔[6]

مذکورہ آیہ شریفہ میں، اسلام ان تمام چار معانی کا حامل ہے، کیونکہ انسان تکوینی طور پر اپنی راہ کا خود انتخاب کرتا ہے اور اپنی تقدیر کا خود فیصلہ کرتا ہے اور دین اسلام کو قبول کر کے، فطرت کی آواز کا مثبت جواب دیتا ہے، کیونکہ یہ دین فطرت اور عقل سلیم کے مطابق ہے

اور انسان اس کو قبول کر کے، حقیقت میں دوسرے انبیاء اور ان کے ادیان کی بھی تصدیق کرتا ہے اور جانتا ہے کہ وہ بھی حقیقی انبیائے الٰہی اور خدا کے سچے دین کے مبلغ اور انسان کے کمال کی طرف ہدایت کرنے والے تھے اور جن منحرف نا شدہ ادیان کو لے کر آئے تھے وہ مکمل دین کے لئے راہ ہموار کرنے والے تھے کہ اسلام کے علاوہ کوئی اور دین یہ خصوصیت نہیں رکھتا ہے۔ اس لئے اس دین کی پیروی کر کے انسان، خدا وند متعال کے حضور تسلیم محض ہو کر اور دوسری متفرق راہوں کو چھوڑ کر خدا کی صراط مستقیم پر گامزن ہوتا ہے۔[7]

اس دین کو قبول کرنے کے بھی مختلف مراحل اور درجات ہیں:

۱) شہادتین پڑھ کر اسلام کو ظاہری طور پر قبول کرنا اور ممکن ہے اوامر ونواہی الٰہی کو ظاہری طور پر قبول کر کے ان پر عمل کرنا اعتقاد اور قلبی ایمان کے ہمراہ نہ ہو، لیکن اس پر مسلمان ہونے کا اطلاق ہوگا، مثال کے طور پر نکاح، معاملہ، بدن ولباس کی طہارت اور جان ومال کی حرمت وغیرہ کے احکام۔[8]

۲) اسلام کو قلبی ایمان اور تمام معارف حقہ الٰہی پر یقین اور تصدیق وتسلیم کے ساتھ دل وجان سے قبول کرنا، اگر چہ ممکن ہے کہ بعض موارد میں عملا نافرمانی یا شک وشبہ سے دوچار ہو جائے[9]، یا کوئی کام قلبی کراہت کے ساتھ انجام دے۔

۳) اسلام کو قلبی چاہت، خدا، دین اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سرشار ایمان کے ساتھ قبول کرنا، جس کا نتیجہ، پروردگار عالم، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امام علیہ السلام کے مقابل میں خضوع وخشوع اور ان کے اوامر ونواہی پر عمل کرنا ہوتا ہے، اور ان کو قبول کرنے کے سلسلہ میں دل میں کسی قسم کے حرج یا کراہت کا احساس نہیں کرتا ہے۔[10] اس حالت میں بندہ اپنے آپ کو خدا وند متعال کا مملوک اور پروردگار عالم کو اپنا مالک کل جانتا ہے اور اس کی مرضی کو اپنی مرضی میں تبدیل کرتا ہے اور اسی چیز کو پسند کرتا ہے جسے اس کا محبوب پسند کرے۔

٤) تسلیم حق ہونا، وہ تسلیم جس میں بندہ اپنے لئے کسی آزادی یا ارادہ کا مشاہدہ نہیں کرتا ہے، اس طرح خدا کے فرمان اور حکم کے علاوہ کوئی ارادہ نہیں کرتا ہے اس کا تمام عشق ومحبت اور ہم وغم اپنے معبود کی جس طرح بھی ممکن ہو، مرضی کو حاصل کرنا ہوتا ہے اور اس کے علاوہ کچھ نہیں، اس مقام پر وہ، اولیائے الٰہی کے درجہ پر فائز ہوتا ہے اور اس کے لئے ایک ایسی حالت پیدا ہوتی ہے، جس میں اسے نہ کوئی خوف باقی رہتا ہے اور نہ کوئی رنج وغم، [11] نہ گزرے ہوئے پر افسوس کرتا ہے اور نہ کسی کھوئی ہوئی چیز پر اسے پریشانی ہوتی ہے اور نہ اپنے مستقبل کے بارے میں خائف ہوتا ہے۔ [12] کیونکہ وہ اطمینان کے مقام پر پہنچا ہے اور صرف دعوت حق پر لبیک کرنے اور اپنے مالک حقیقی سے جا ملنے کا منتظر ہوتا ہے [13] اور اس راہ میں جس چیز سے بھی دو چار ہو اس کے لئے خوشنودی حق کے سوا کچھ نہیں ہے خواہ یہ اس کے لئے حادثہ کربلا ہی کیوں نہ ہو!

پس حقیقی اسلام وہ ہے، جس کے جامع مراتب، ایسے ہی مراتب ہوں۔ [14] اس لحاظ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسلام کسی اور دین سے قابل موازنہ نہیں ہے، چنانچہ ائمہ ہدیٰ علیہم السلام کا اسلام بھی دوسروں کے اسلام سے قابل موازنہ نہیں ہے۔ اس دعویٰ کی نشانیاں اور آثار وقرائن اس قدر زیادہ ہیں کہ اس مختصر مقالہ میں ان سب کا ذکر کرنے کی مجال نہیں ہے اس لئے ہم محققین سے گزارش کرتے ہیں کہ اس سلسلہ میں تفصیلات جاننے کے لئے سیرت اور تاریخ کی کتابوں کا مطالعہ کریں!

خلاصہ یہ کہ، خداوند متعال کے سامنے تسلیم محض ہونے کے لئے دین اسلام کو قبول کرنا ضروری ہے اور دین اسلام کو قبول کرنے کے لئے خداوند متعال کے حضور تسلیم محض ہونا ضروری ہے۔ یہ ایک ایسی لطافت ہے جو اس لفظ اور عنوان میں مضمر ہے اور ہر معنی، دوسرے معنی کا لازمہ ہے اور ایک دوسرے سے جدا نہیں ہے تاکہ ہم یہ کہیں کہ یہ معنی یا وہ معنی!

دوسری جانب چونکہ یہ دین ولایت کے ذریعہ کامل اور تمام ہوا ہے، یعنی غدیر خم میں امام علی علیہ السلام کے امامت پر منصوب ہونے سے کامل اور تمام ہوا ہے،[15] اس لئے ولایت کا منکر خدا کے حکم کے مقابل میں تسلیم محض نہیں ہوتا ہے، پس اس نے حقیقی اسلام (کامل صورت میں دین) کو قبول نہیں کیا ہے اور شریعت کی اطاعت کرنے میں اس نے تبعیض کی راہ کا انتخاب کیا ہے، یعنی بعض چیزوں پر عمل کرنے اور بعض چیزوں کو چھوڑنے کی راہ اختیار کی ہے، جبکہ خداوند متعال فرماتا ہے: ایمان والو! اللہ ورسول کی اطاعت کرو اور اس سے روگردانی نہ کرو جب کہ تم سن رہے ہو۔ اور ان لوگوں جیسے نہ ہو جاؤ جو یہ کہتے ہیں کہ ہم نے سنا حالانکہ وہ کچھ نہیں سن رہے ہیں ۔ اللہ کے نزدیک زمین پر چلنے والے بدترین وہ بہرے اور گونگے ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے ہیں ...اے ایمان والو اللہ اور رسول کی آواز پر لبیک کہو جب وہ تمہیں اس امر کی طرف دعوت دیں جس میں تمہاری زندگی ہے ...ایمان والو! خدا اور رسول اور اپنی امانتوں کے بارے میں خیانت نہ کرو جبکہ تم جانتے بھی ہو۔[16] مزید فرمایا: اور کہہ دو کہ حق تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے اب جس کا جی چاہے ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے کافر ہو جائے، ہم نے یقینا کافرین کے لئے اس آگ کا انتظام کر دیا ہے جس کے پردے چاروں طرف سے گھیرے ہوں گے اور وہ فریاد بھی کریں گے تو پگھلے ہوئے تانبے کی طرح کھولتے ہوئے پانی سے ان کی فریاد رسی کی جائے گی جو چہروں کو بھون ڈالے گا یہ بدترین مشروب ہے اور جہنم بدترین ٹھکانا ہے۔[17] اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ عترت وقرآن دو گرانقدر امانتیں ہیں، کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں ان دو اور دونوں سے قیامت تک تمسک کرنے کی سفارش اور تاکید کی ہے، کیونکہ ثقلین نامی مشہور حدیث شیعہ وسنی کے درمیان ایک متواتر حدیث ہے۔ پس ولایت کے بغیر اسلام، حقیقی اسلام نہیں ہے اور خدا کا پسندیدہ نہیں ہوگا۔

حواشی

[1]۔سورہ آل عمران، ۸۳،سورہ رعد، ۱۵،سورہ فصلت، ۱۱۔

[2]۔ملاحظہ ہو: عنوان: اختیار و مشیت الہ،سؤال ۱۵۳،سورہ عنکبوت، ۹۸۔

[3]۔سورہ انعام، ۷۹۔

[4]۔سورہ احزاب، ۳۶،سورہ انعام، ۱۲۷۔ ۱۲۲،سورہ نساء، ۷۰۔ ۶۰۔

[5] سورہ احزاب، ۴۰ ، ملاحظہ ہو: مطہری، مرتضی، خاتمیت ۔

[6]۔سورہ آل عمران، ۹۵۔ ۷۹۔

[7] سورہ انعام، ۱۵۳،سورہ مائدہ، ۱۹۔ ۱۵۔

[8]۔سورہ حجرات، ۱۴۴۔

[9]۔سورہ زخرف، ۶۹،سورہ بقرہ، ۲۰۸،سورہ حجرات، ۱۵۔

[10]۔سوہ نساء، ۶۵،سورہ مؤمنون، ۳۔ ۱۔

[11]۔سورہ یونس، ۶۲۔

[12]۔سورہ حدید، ۲۳ سورہ آل عمران، ۱۵۳۔

[13]۔سورہ فجر، ۳۰۔ ۲۷۔

[14] ملاحظہ ہو: المیز ان، ج۱ص ۳۰۳۔ ۳۰۰۔

[15]۔ملاحظہ ہو: عنوان: تحریف اور غیر شیعہ مذاہب سوال نمبر ۲۶۰،سورہ مائدہ، ۳ و ۶۷۔

[16]۔سورہ انفال، ۲۷۔ ۲۰۔

[17]۔سورہ کہف، ۲۹۔

اگر عصمت کا مقام خداوند متعال کی طرف سے ایک مہربانی ہے تو ایک معصوم اور ایک غیر معصوم کے مرتکب گناہ نہ ہونے کے اجر کو کیسے بیان کیا جا سکتا ہے؟

اجمالی جواب

۱۔عصمت کا مطلب یہ ہے کہ: معصوم انسان کے اندر ایسے امر کا موجود ہونا، جو اسے خطا اور معصیت سے دو چار ہونے سے بچانے کا سبب بنے۔ یہ امر معصوم کے گناہ کے برے اثرات کے بارے میں آگاہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یا عصمت، ایک ایسی چیز ہے، جو انسان کو خداوند متعال کی معرفت حاصل کرنے کا مرتبہ بلند ہونے کے نتیجہ میں اور حق کے جمال و کمال کی نسبت اس کی محبت اور اپنے معبود کے ساتھ عشق و محبت اور خداوند متعال کے جمال وجلال کو ادراک کرنے کے نتیجہ میں حاصل ہوتی ہے۔

۲۔عصمت کی دو قسمیں ہیں: علمی عصمت اور عملی عصمت۔ دونوں قسمیں ذاتی اور حقیقی طور پر ایک دوسرے سے جدا ہیں، لیکن انبیائے الہی، عصمت کی ان دونوں قسموں کے مالک ہوتے ہین، یعنی ان کا کردار بھی صالح اور حقیقت کے مطابق ہوتا ہے اور ان کے علم و دانش کا سرچشمہ بھی صحیح اور ہر قسم کی غلطی اور سہو ونسیان سے پاک ہوتا ہے۔

٣۔اول یہ کہ عصمت کا مقام ایک ذاتی اور محدود مقام نہیں ہے، یعنی انسانوں کے بارے میں یہ ایک اکتسابی مقام ہے اور اس مقام تک پہنچنے کے لئے کافی پریشانی اور جدو جہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ دین کے پیشواؤں کے علاوہ دوسرے لوگ بھی اس مقام پر فائز ہو سکتے ہیں لیکن اس کے کلیدی عہدے، جیسے نبوت و امامت کے مقام تک پہنچنا محدود اور منحصر ہے، یعنی ہر معصوم ان مقامات تک نہیں پہنچ سکتا ہے۔

٤۔ایک معصوم کے اجر کے بارے میں سوال کرنے کا سبب یہ ہے کہ، گمان کیا گیا ہے کہ چونکہ عصمت کا مقام لطف ومہربانی پر مشتمل مقام ہے، اس لئے معصوم ذاتی طور پر گناہ سے منزہ ہے اور قاعدتاً اس کے لئے کوئی ثواب نہیں ہونا چاہئے کیونکہ معصوم خدا کے نزدیک فرشتوں کے مقام کے مانند گناہ کی طرف رجحان نہیں رکھتا ہے۔لیکن اس امر کی طرف توجہ کی جانی چاہئے کہ اگر چہ عصمت کا مقام ایک ذاتی مقام نہیں ہے، ایک معصوم سے گناہ صادر ہونا بھی ذاتی طور پر محال نہیں ہے، معصومین انسان ہیں نہ کہ ملائکہ کی ایک قسم اور اگر وہ گناہ نہیں کرتے ہیں تو وہ ان کے اپنے اختیار کے سبب ہے اور یہ بھی ان کے ایمان اور مکمل یقین کی وجہ سے ہے جو کامل انسانوں میں ذات اقدس باری تعالی اور عالم غیب کے بارے میں پایا جاتا ہے، جس کی وجہ سے وہ گناہ اور معصیت سے اجتناب کرتے ہیں، حتی کہ وہ اپنی فکر وتصور میں بھی گناہ ومعصیت کو راہ نہیں دیتے ہیں، کیونکہ ایک معصوم گناہ کی برائی کو مکمل طور پر ادراک کرتا ہے ۔ پس قاعدہ سے ایک معصوم انسان اپنے اعمال کے مقابل میں اور محرمات سے اپنے نفس کو بچانے کے سلسلہ میں خدا کے پاس اجر رکھتا ہے، جس طرح ایک غیر معصوم گناہ نہ کرنے کے سبب اجر پاتا ہے اور ممکن ہے کہ ایک معصوم کے گناہ نہ کرنے کا اجر زیادہ ہو، کیونکہ وہ اس عزت نفس سے دو کام انجام دیتا ہے: ایک یہ کہ خود کو گناہ سے محفوظ رکھ کر معصیت سے دو چار نہیں ہوتا ہے اور دوسرا یہ کہ اپنے مقام وعہدہ کی قدر ومنزلت کی حفاظت

کرتا ہے اور نبوت و امامت کے مقام کی بے احترامی نہیں کرتا ہے ۔ بالفرض اگر کوئی معصوم مرتکب گناہ ہو جائے، تو اس کا گناہ دوگنا بلکہ کئی گنا محسوب ہو گا، کیونکہ اول یہ کہ وہ گناہ کا مرتکب ہوا ہے، دوسرے یہ کہ اس نے مقام الٰہی کا پاس نہیں کیا ہے۔ بہر حال معصوم کے خدا کے پاس اجر حاصل کرنے میں کوئی ممانعت لازم نہیں ہے۔

تفصیلی جواب

جواب کی وضاحت سے پہلے عصمت کی حقیقت سے آگاہ ہونا ضروری ہے[1]، تاکہ معصوم افراد میں گناہ کے مقابل میں عصمت کو جان لیا جائے ۔ علامہ طباطبائی فرماتے ہیں: عصمت سے مراد معصوم انسان کے اندر ایک امر کا وجود ہے جو اسے ناجائز (خطا ومعصیت) سے دوچار ہونے سے بچانے کا سبب بن جاتا ہے۔ [2] البتہ ان کی نظر میں، انبیائے الٰہی (اور تمام اولیا اور خاص ہدایت یافتہ افراد) عصمت مطلق کے حامل ہوتے ہیں اور اشتباہ (خطا) سے عصمت کے بہت سارے مصادیق ہیں جو عصمت کے تمام اقسام پر مشتمل ہو سکتے ہیں ۔لیکن چونکہ صرف گناہوں کے مقابل میں عصمت کے بارے میں سوال کیا گیا ہے، اس لئے ہم عصمت کے تمام پہلوؤں اور قسموں کی وضاحت کرنے سے اجتناب کرتے ہیں اور اس سلسلہ میں تفصیلات حاصل کرنے کی دلچسپی رکھنے والوں کو متعلقہ کتابوں کا مطالعہ کرنے کی رائے دیتے ہیں ۔[3] ان کی نظر میں عصمت گناہ کے نتائج کے بارے میں معصوم کے علم و آگاہی کا نتیجہ ہے، یعنی گناہوں کے آثار کے بارے میں معصومین کا علم وشعور اس طرح ہوتا ہے کہ کوئی بھی گناہ ان کو مغلوب نہیں کرسکتا ہے بلکہ وہ تمام گناہوں پر غالب ہوتے ہیں۔[4]

عصمت کے بارے میں ایک دوسرے نظریہ کے مطابق کہا جاتا ہے کہ: معصوم، خداوند متعال کی معرفت کے سلسلہ میں بلند مرتبہ پر فائز ہونے اور حق تعالیٰ کے جمال وکمال

سے محبت کے سبب اپنے آپ کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا ہے کہ وہ خداوند متعال کی مرضی کے خلاف کوئی اقدام کرے، اس کے علاوہ اپنے معبود کے بارے میں عشق ومحبت اور اس کے جمال وجلال کا ادراک کرنا اور اس کے حق میں اس کی لا متناہی نعمتوں سے آگاہی، اس کی روح میں اس قدر خضوع وفروتنی پیدا کرتی ہے کہ وہ کبھی گناہ کا تصور بھی نہیں کرتا ہے، گناہ انجام دینے کی بات ہی نہیں![5]

ان دونظریوں کا ماحصل یہ ہے کہ معصوم کے وجود میں ایک ملکہ پیدا ہوتا ہے، جو اس کی زندگی سے گناہ، گستاخی اور برے کام کو ہمیشہ دور کرتا رہتا ہے اور اسے گناہ اور لغزشوں سے محفوظ رکھتا ہے۔

عصمت کی قسمیں: عصمت کی دو قسمیں ہیں: عصمت علمی اور عصمت عملی ۔ یہ دو قسمیں ذاتی اور حقیقی طور پر ایک دوسرے سے جدا ہیں ۔ ممکن ہے کوئی شخص علمی ملکہ میں معصوم ہو،[6] لیکن عملی ملکہ میں معصوم نہ ہو اور اس کے برعکس بھی لیکن جو عصمت انبیائے الٰہی میں پائی جاتی ہے وہ عصمت کی دونوں قسموں پر مشتمل ہوتی ہے اور انبیا علم وعمل میں معصوم ہوتے ہیں، یعنی ان کا کردار بھی صالح اور حقیقت کے مطابق ہوتا ہے، اور ان کا علم بھی صحیح اور ایک ایسے سر چشمہ سے تعلق رکھتا ہے، جس میں کسی قسم کے اشتباہ، سہو وخطا اور بھول چوک نہیں ہے، کیونکہ وہ عقل مجرد، شہود محض اور صحیح کشف کے ایک ایسے مرحلہ پر پہنچا ہوتا ہے کہ جس میں وہم وگمان بھی عقل کے تابع ہوتا ہے اور اس مرحلہ میں کسی صورت میں شیطانی وسوسے اس میں نفوذ نہیں کر سکتے ہیں کیونکہ جہالت، نادانی، شیطنتیں اور توہمات کا انحصار وہم وگمان پر ہوتا ہے اور بے شک وہم وگمان کا دائرہ عمل مادی دنیا سے وابستگی ہے، لیکن خالص عقل کے حدود میں شیطان اور وہم وگمان کی پہنچ نہیں ہوتی ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص اتنا بڑھے کہ کہ مادی دنیا، وہم وگمان اور توہمات سے گزر کر حقائق کے سر چشمہ تک پہنچ جائے تو وہ

عصمت کے مقام پر فائز ہوسکتا ہے اور اس کے وجودی شدت کے نتیجہ میں اس کا نفس ناطقہ فرشتوں کے مرتبہ یا اس سے بالاتر مرحلہ سعادت حاصل کرسکتا ہے [7]

عصمت کا ذاتی اور محدود نہ ہونا: ایک اور مطلب جس کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے وہ یہ کہ عصمت کا ملکہ اگرچہ خداوند متعال کی طرف سے حاصل ہونے والی مہربانی اور توفیق ہے، لیکن عصمت کا ملکہ نہ ذاتی ہے اور نہ محدود، بلکہ اختیاری ہے اور انبیا کے علاوہ، دوسرے بھی اس ملکہ کے حامل ہو سکتے ہیں، کیونکہ ریاضت، کوشش اور نفسانی جدوجہد کا راستہ سبھوں کے لئے کھلا ہے اور ان کا ماحصل عام اور سبھوں کے لئے یکساں ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید فرماتا ہے: إِنْ تَتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَلْ لَكُمْ فُرْقَانًا [8] اگر تم تقوی الٰہی اختیار کروگے تو وہ تمھیں حق و باطل میں تفرقہ کی صلاحیت عطا کر دے گا۔ تہذیب نفس، پرہیز گاری، اعضا و جوارح اور نفسانی خواہشات کی دیکھ بھال اور نگرانی کرنے، حلال غذا کھانے اور محاسبہ کرنے اور چوکس رہنے سے انسان علم و عمل میں عصمت کے اس پرشکوہ ملکہ کو حاصل کر کے آہنی ارادہ کا مالک بن سکتا ہے۔

لیکن قابل توجہ بات ہے کہ نبوت و امامت کا مقام محدود اور منحصر ہے۔ یعنی ہر معصوم اس مقام تک نہیں پہنچ سکتا ہے اور خداوند متعال اپنی نمایندگی کے حساس اور کلیدی عہدے ہر کسی کو، حتی کہ ہر معصوم کو نہیں سونپتا ہے۔[9]

عصمت کا اکتسابی ہونا: عصمت وثواب کے لطف و مہربانی پر مبنی نہ ہونے کے سلسلہ میں قابل توجہ امر ہے کہ انبیائے الٰہی، دینی پیشواؤں اور ہر دوسرے معصوم کی عصمت ذاتی نہیں ہے، بلکہ اکتسابی ہے۔ اس کا سرچشمہ وہ مکمل ایمان واعتقاد ہے جو کامل انسانوں میں پایا جاتا ہے اور وہ اپنے آپ کو ہمیشہ خدا کے حضور میں پاتے ہیں اور اس کا مشاہدہ کرتے ہیں جو ہر چیز کا جاننے والا اور تمام امور کا احاطہ کرنے والا ہے، اس لئے معصومین سے گناہ کا

ارتکاب ہونا ذاتی طور پر ممنوع نہیں ہے، کیونکہ اگر یہ ذاتی طور پر ممنوع اور محال ہوتا تو مقدور نہیں ہوتا اور اگر مقدور نہ ہوتا تو تکلیف نہیں بنتا۔

اس کے علاوہ اگر گناہ و معصیت ذاتاً محال ہو تو اطاعت و فرمانبرداری ذاتی طور پر ضروری ہو گی! اور اس صورت میں اطاعت بھی تکلیف نہیں بنتی اور پھر ڈرانے، بشارت دینے، وعدہ اور وعید کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی، اسی لئے فرشتے مکلف نہیں ہیں، کیونکہ وہ ذاتی عصمت کے مالک ہیں، نہ کہ اختیاری۔

لیکن اکتسابی وغیر ذاتی عصمت کے ملکہ میں اختیار پایا جاتا ہے اور فعل کے انجام دینے یا ترک کرنے کو قضیہ ممکنہ کے طور پر معصوم سے نسبت دی جاسکتی ہے، اگر چہ معصوم سے گناہ صادر ہونا معمولاً محال ہے، لیکن یہ ایک بالاختیار امتناع ہے اور اختیار کے منافی نہیں ہے۔ یہ سب اس لئے ہے کہ معصوم گناہ کی برائی اور انجام کا مشاہدہ کرتا ہے اور اس کا دل و دماغ رحمانی ہے، نہ کہ شیطانی۔ [10]

پس ایسا نہیں ہے کہ ایک معصوم گناہ کے مرتکب نہ ہونے کی وجہ سے اجر کا مستحق نہ ہو، بلکہ وہ بھی ایک عام انسان ہے: قُلْ إِنَّمَآ أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰٓ إِلَيَّ [11] اے پیغمبر! کہدو کہ میں بھی آپ لوگوں کے مانند ایک انسان ہوں لیکن مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ معصوم، خداوند متعال کی عنایات اور مہربانیوں سے اور ایمان کامل، خدا کے عشق اور بلند مرتبہ میں پرہیز گاری کی روشنی میں عصمت کے مقام پر پہنچتا ہے۔ لیکن بہر حال گناہ کا اختیار اس سے سلب نہیں ہوتا ہے اور جب چاہے گناہ کا مرتکب ہوسکتا ہے۔ لیکن اپنے اختیار اور خدا کی مدد حاصل کر کے اپنے آہنی ارادہ سے اپنے نفس امارہ اور شیطان کے مقابل میں مقاومت کرتا ہے اور اپنے آپ کو گناہ سے آلودہ نہیں ہونے دیتا ہے اور اپنے نفسانی خواہشات سے اس جدوجہد کے نتیجہ میں اجر پاتا ہے۔

اور ممکن ہے کہ ایک معصوم کی خوبیوں اور گناہ نہ کرنے کا اجر زیادہ ہو، کیونکہ جن افراد سے زیادہ توقع کی جاتی ہے، ان کے توسط سے انجام پائی گئی خوبیوں کے دو نتیجے ہوتے ہیں: ایک یہ کہ اس نے اپنے نفس سے مجاہدہ کیا ہے اور دوسرے یہ کہ اپنے مقام کی بے احترامی نہیں کی ہے اور اپنے عہدہ اور مقام کو آبرومندانہ طور پر محفوظ رکھا ہے۔ چنانچہ اگر معصوم کسی برے عمل کا مرتکب ہو جائے تو اس کا گناہ دوگنا بلکہ کئی گنا محسوب ہوگا۔ کیونکہ وہ اولاً برے عمل کا مرتکب ہوا ہے اور ثانیاً اپنے الٰہی مقام کی بے احترامی کا باعث قرار پایا۔ اس لئے ہم قرآن مجید کی آیات میں مشاہدہ کرتے ہیں کہ انبیا کو شدید انتباہ کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ مثال کے طور پر خاتم الانبیا حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب ہوتا ہے: لئن اشرکت لیحبطن عملک [12] اگر تم شرک اختیار کرو گے تو تمہارے تمام اعمال برباد کر دیئے جائیں گے۔

حواشی

[1]۔ ملاحظہ ہو: عناوین: عصمت انبیا، سوال 112، قرآن مجید میں انبیا کی عصمت وعدم عصمت سے مربوط آیات، سوال ۱۲۹، عام انسانوں کی عصمت، سوال ۸۶۱۔

[2]۔ طباطبائی، سید محمد حسین، المیزان فی تفسیر القرآن، ج۲، ص ۱۳٤ (کلام فی عصمہ الانبیا)

[3] ملاحظہ ہو: ایضا، ج۲، ص۱۳٦۔ ۱۳٤، ج٥، ص ۷۷۔ ۷٥، جوادی آملی، عبداللہ، تفسیر موضوعی قرآن کریم، ج۳، ص۲۹۲۔ ۱۹۷۔۔

[4]۔ ایضا، ج٥، ص۷۸۔ [5]۔ سبحانی جعفر، منشور جاوید، ج٥، ص۱٤۔

[6]۔ قابل ذکر بات ہے کہ اگرچہ عملی عصمت دوسروں کے لئے بھی حاصل کرنا ممکن ہے لیکن اکثر علما یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ علمی عصمت دوسروں (غیر معصوم) کے لئے ممکن نہیں ہے۔

[7]۔ یہ مطالب استاد جوادی آملی کے بیانات سے لئے گئے ہیں، تفسیر موضوعی قرآن مجید ج۳، ص۲۰۲۔ ۱۹۹۔

[8]۔ سورہ انفال، ۲۹۔ [9]۔ جوادی آملی، عبداللہ، تفسیر موضوعی قرآن مجید، ج۳، ص ۲۰۸۔

[10]۔ جوادی آملی، عبداللہ، تفسیر موضوعی قرآن مجید ج۳، ص ۲۰۸ و ۲۰۹ با تلخیص

[11]۔ سورہ کہف، ۱۱۰۔ [12]۔ سورہ زمر، ٦٥۔

کیا قیامت کبریٰ کے وقت خداوند متعال کے علاوہ تمام موجودات مرجائیں گی؟ حتی عزرائیل بھی؟

مختصر جواب

سوال کا ہم دو حصوں میں جواب دیتے ہیں:

۱۔ قیامت کے دوران موت کی ماہیت اور اس کی وسعت

۲ جو اس (موت) سے مستثنٰی قرار پائے ہیں

پہلا حصہ:

قرآن مجید کے مطابق، ہر چیز کی موت اس وقت آتی ہے جب اس چیز کی اجل پہنچتی ہے چونکہ تمام موجودات حامل اجل ہیں، اس لئے سب کو، خواہ انسان ہوں یا غیر انسان، موت سے ضرور دوچار ہونا ہے۔

ہر چیز کی معین شدہ اجل ایک ایسے خدا کے پاس ہے، جو باقی اور لافانی ہے اور موت ایک فانی زندگی سے ایک باقی رہنے والی اور لافانی زندگی میں خدا کے پاس منتقل ہونا ہے۔ تمام موجودات کو اپنی لپیٹ میں لینے والی موت، قیامت کے دن آئے گی اور حقیقت میں قیامت تمام موجودات کا خدا کے سامنے حاضر ہونے کا میدان ہے۔

قرآن مجید اس حادثہ کا منشا ایک صور (بگل) کا بجنا بیان کرتا ہے جو پہلی بار موت کا

سبب اور دوسری بار زندہ کرنے کا سبب ہوگا۔ اس لئے بعض آیات و روایات تمام آسمانوں اور زمین کے نابود ہونے کی حکایت کرتی ہیں اور بعض ان میں موجود تمام مخلوقات کے فنا ہونے کو بیان کرتی ہیں اور بعض دوسری آیات و روایات فنا ہوئی تمام مخلوقات کے قیامت میں، یعنی حیات ابدی کی جلوہ گاہ میں داخل ہونے کی حکایت کرتی ہیں۔

ان آیات و روایات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمان، زمین، عالم برزخ اور جو بھی وہاں پر موجود ہیں حتی کہ حاملان عرش اور پروردگار عالم کے مقرب ملائکہ (جبرئیل، میکائیل اور ملک الموت واسرافیل) بھی دو نفخہ صور سے پیدا ہونے والے ہولناک اور عظیم حوادث، یعنی تمام موجودات کو اپنی لپیٹ میں لینے والی موت اور پھر سب کے محشور ہوجانے سے، بچ نہیں سکتے ہیں۔

دوسرا حصہ:

اشارہ شدہ آیات و روایات جو ایک عظیم حادثہ کی حکایت کرتی ہیں، مذکورہ مطالب کے علاوہ ان افراد کی خصوصیات کو واضح کرتی ہیں، جو بیان شدہ دو نفخہ صور کے خوف اور نا قابل برداشت رنج والم سے مستثنیٰ قرار پائے ہیں اور ان حوادث سے بچ کر امن و امان کی حالت میں اپنی حیات کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ قرآن مجید کے بیان کے مطابق یہ افراد کلی طور پر دو خصوصیتوں کے مالک ہیں یہ دو خصوصیت حقیقت میں ایک ہی چیز ہیں جس کی دو تعبیریں ہیں:

۱۔ محض و مطلق حسنہ کا حامل ہونا اور ہر قسم کے گناہ اور آلودگی سے پاک و منزہ ہونا۔

۲۔ خالص ہونا اور خدا کا مخلص بندہ بن جانا۔

یہ وہ انسان ہیں، جو دنیا میں، خدا کی راہ میں مجاہدے اور ریاضتوں کے سبب، دنیا

کے تعلقات، مثالی صورتوں اور برزخی قالبوں سے رہائی پا کر اپنے مقصد تک پہنچے ہیں اور براہ راست اپنے پروردگار کی بہشت میں داخل ہو چکے ہیں۔ اس لئے ان کے لئے نہ برزخ میں کوئی توقف ہے اور نہ قیامت کے رنج والم سے دوچار ہوتے ہیں۔ حقیقت میں وہ "**موتوا قبل ان تموتوا**" کے مظہر ہیں۔

ان افراد کے مکمل اور حقیقی مصداق وہی چودہ معصومین علیہم السلام ہیں۔ اگر چہ انبیا و اولیائے الٰہی اور وہ انسان جو دشمنیوں سے منزہ و پاک ہوکر ان چودہ مقدس ونورانی شخصیتوں کے مقام ولایت کے عارف و دوستدار ہیں، بھی مذکورہ دونفخوں کے ہولناک حوادث سے مستثنیٰ ہیں اور ہوں گے۔

تفصیلی جواب

اس سوال کا ایک مناسب اور شائستہ جواب دینے کے لئے ہم پہلے قیامت کے آغاز پر آنے والی موت کی ماہیت اور اس کی وسعت کے بارے میں وضاحت کریں گے اور اس کے بعد اس سوال کا جواب دیں گے کہ کیا ایسے افراد بھی ہیں جو اس عالم گیر موت کے چنگل میں نہ پھنس سکیں گے؟ اور ایسے افراد کے موجود ہونے کی صورت میں ان کے نام ونشان اور صفات کیا ہیں؟ اور ان کے مصداق یا مصادیق کون ہیں؟

پہلا حصہ:

پہلے حصہ میں کہنا چاہئے کہ: قرآن مجید کے مطابق ہر چیز کی موت اس وقت آتی ہے جب اس چیز کی اجل پہنچ جائے تمام موجودات، من جملہ انسان وغیر انسان اس اجل کے حامل ہیں [1]۔ تمام موجودات اپنی حرکت اور سفر میں ایک ایسے نقطہ پر پہنچ جائیں گے جہاں پر رکنے کے بعد ختم ہوکر استقرار پا جائیں گے۔ قرآن مجید کے ارشادات کے مطابق یہ استقرار اور ثبات کا نقطہ، خداوند متعال کے پاس ہے۔ (**وَاَجَلٌ مُّسَمًّى عِنۡدَهٗ**)[2] اور جو

خداوندمتعال کے پاس ہے وہ لافانی اور باقی رہنے والا ہے۔(وَمَا عِنۡدَ اللّٰہِ بَاقٍ ؕ)[3]۔ اس لئے، جب موجودات بارگاہ الٰہی میں پہنچتے ہیں اوراس کے حضور میں حاضر ہوتے ہیں تو وہ ایک ابدی اور لافانی حیات پاتے ہیں۔تمام موجودات خواہ انسان ہوں یا غیرانسان، خدا کی طرف لوٹ کے جانے والے ہیں اورسرانجام اس کی طرف پلٹ کراس کی بارگاہ میں حاضر و محشور ہوتے ہیں یہ خدا کی طرف عام طور پر لوٹ کر جانا وہی موت ہے، یعنی، ایک ایسی زندگی سے نکل جانا جس میں، تحرک، فساد، تبدیلی، زمان، تنگی، تاریکی، کثرت وپراکندگی و...موجود ہیں اور خدا کے پاس زندگی میں داخل ہونا، جس میں حیات، بقائے محض، ہمیشگی، وسعت، نور اور وحدت اور................ مذکورہ نقائص سے پاک ومنزہ ہوکر تجلی پانا ہے لہٰذا یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ تمام موجودات، انسان سے لے کر آسمانوں اور زمین اور جو چیز ان کے اندر موجود ہے، سب اسی طرح مرنے والے ہیں، اگر چہ یہ مطلب مختلف الفاظ میں بیان ہوا ہے مثال کے طور پر انسان کا مرنا، اس کے بدن سے روح کا نکل جانا ہے جس کو موت کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے اور غیر انسان کے مرنے کو دوسری تعبیروں سے یاد کیا گیا ہے ہم اس پر روشنی ڈالیں گے۔

اس قسم کی اجل اور موت، جس سے تمام موجودات دو چار ہوں گے اور پوری کائنات کو اپنی لپیٹ میں لے گی، قیامت کبری کے دن محقق ہوگی اوراس کی وسعت خداوند متعال کے علاوہ تمام مخلوقات کو اپنی لپیٹ میں لے گی اور حقیقت میں قیامت کے دن سب کی اجل پہنچ جائے گی اور تمام مخلوقات قیامت، یعنی بارگاہ الٰہی، میں قدم رکھیں گی

دوسرے الفاظ میں قیامت کبری کے دن دنیا، برزخ، آسمانوں اور زمین کی بساط سمیٹ لی جائے گی اور عام اہل دنیا، اہل برزخ اور اہل آسمان (ملائکہ و...) نابود ہوجائیں گے اور اس کے بعد قیامت بر پا ہوگی اور سب خدا کے حضور محشور ہوں گے اور ایک ابدی

زندگی اور بقائے محض پائیں گے اس قسم کی حالت (قیامت کی زندگی اور خدا کے نزدیک حیات) کا بیان اور اس کی خصوصیات کی شناخت، جس کی جلوہ گاہ قیامت کا میدان ہے، قرآن مجید اور روایات میں قیامت کے سلسلہ میں بیان کئے گئے اوصاف و تفصیلات کا مطالعہ اور تحقیق کر کے حاصل کرنا ممکن ہے لیکن اس موضوع پر ایک مستقل کتاب تالیف کرنے کی ضرورت ہے

قرآن مجید میں اس قسم کے حادثہ کا منشا نفخہ صور[4] تعبیر کیا گیا ہے اور صور کو پھونکنے میں قیامت کے دن مارنے اور زندہ کر کے محشور کرنے کے دونوں سبب پائے جاتے ہیں اس کے علاوہ اس حادثہ کے بارے میں صیحہ[5] (چیخ پکار)، زجرہ[6] (چیخ)، صاخہ[7] (شدید چیخ) اور نقر فی الناقری[8] (ایک ایسی چیز میں پھونک مارنا جس سے آواز نکل آئے) جیسی تعبیریں کی گئی ہیں ان الفاظ کے مجموعہ سے، جو ایک حقیقت بیان کرتے ہیں، معلوم ہوتا ہے۔

صور اور اس کے دو نفخہ اسی بگل کی حکایت کرتے ہیں جو فوج میں جنگ کے آغاز پر استعمال ہوتا ہے پہلی بار صور پھونکا جاتا ہے کہ خاموش ہو جایئے اور روانہ ہونے کے لئے آمادہ ہو جایئے اور پھر دوسری بار صور پھونکا جاتا ہے کہ اٹھیے اور......[9]

اس عظیم حادثہ کی تشریح اور وضاحت کے بارے میں قرآن مجید کی آیات اور روایتیں چند قسم کی ہیں:

۱ وہ آیات جو مرگ و خاموشی کا بگل بجنے سے آسمانوں اور زمین کی بساط کو لپیٹے جانے کی حکایت کرتی ہیں، جیسے: پھر جب صور میں پہلی مرتبہ پھونکا جائے گا اور زمین اور پہاڑوں کو اکھاڑ کر ٹکرا کر ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا تو اس دن قیامت واقع ہو جائے گی[10]، اس دن ہم تمام آسمانوں کو اس طرح لپیٹ دیں گے جس طرح خطوں کا طومار لپیٹا جاتا

ہے [11] اور قیامت کے دن سارے آسمان اس کے ہاتھ میں لپیٹے ہوئے ہوں گے [12] اسی طرح دوسری آیات [13] جو سب کی سب اس حادثہ کی خبر دیتی ہیں جو قیامت بر پا ہونے کے آغاز میں، نفخہ صور کے سبب پوری کائنات کو تحت الشعاع میں قرار دے گا

ان آیات کا مطالعہ اوران پر غور کرنے سے آسمانوں اور زمین کی موت کی کیفیت کو معلوم کیا جا سکتا ہے، یعنی ان کی بساط کو لپیٹنا اوران میں قیامت کے متناسب تغیر وتبدل پیدا کرنا۔

۲ آیات کی ایک قسم اس امر کی دلالت کرتی ہیں کہ جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہیں، موت کے بگل بجنے سے فنا ہو جائیں گے: وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ ...[14]

اور وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ ...[15]

نزع خوف وحشت کے معنی میں ہے اور صعق یعنی بیہوشی اور مدہوشی حقیقت میں یہ دو الفاظ اس موت کی حالت کو بیان کرتے ہیں جن کی تشریح اس تحریر کی ابتدا میں کی گئی، یعنی وہ موت جو خوف و مرگبار بیہوشی سے، جو بھی آسمانوں اور زمیں میں موجوادات ہیں انہیں اپنی لپیٹ میں لے لے

اس لئے اولا برزخ، دنیا کا تتمہ اور ضمیمہ ہے اسے عالم قبر [16] اور اس کی بہشت کو جنہ الدنیا [17] کہا گیا ہے اور ثانیا، تمام اہل دنیا کو ضرور برزخ سے گزرنا ہے [18]، خواہ طولانی یا مختصر، من فی الاض سے مراد زمین کے وہ باشندے ہیں جو برزخ میں داخل ہوئے ہیں، نہ وہ لوگ جو برزخ سے پہلے زمین پر زندگی بسر کر رہے ہیں من فی السموات سے مراد ارواح سعدا و ملائکہ [19] ہیں یہ وہ موجودات ہیں جو مثالی صورتوں اور برزخی قالبوں سے رہائی پا کر عالم برزخ کے اوپر ایک عالم (آسمانوں) میں رہائش پذیر ہیں

نفخہ صور کے سبب ان دو گروہوں (اہل زمین اور اہل آسمان) کی موت، اس معنی میں ہے کہ وہ نہ صرف دنیا اور خاکی بدن سے رہائی پا چکے ہیں، بلکہ وہ مثالی صورتوں اور برزخی قالبوں سے بھی رہائی پا کر اور آسمانوں کی طرف پرواز کرتے ہوئے بارگاہ الٰہی میں پہنچ کر ذات احدیت میں فنا، یعنی فنا فی اللہ ہو چکے ہیں

۳ آیات کی ایک اور قسم، نفخہ حیات[20] اور ان سب کی بقا کی وضاحت کرتی ہے جو پہلے نفخہ میں موت سے دو چار ہوئے ہیں۔ ہم اس تحریر کے خلاصہ کے پیش نظر اور طولانی ہونے سے اجتناب کرتے ہوئے ان آیات کا ذکر کرنے سے صرف نظر کرتے ہیں۔

روایات بھی مذکورہ تین قسم کی آیات کی حکایت کرتی ہیں، ہم ان میں سے بعض کے مضامین کا خلاصہ بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:

اسرافیل نام کا یک فرشتہ خداوند متعال کی اجازت سے موت کا بگل بجاتا ہے اور اس کے نتیجہ میں زمین و سمان میں رہنے والے، حتی کہ حاملان عرش (حضرت جبرئیل و میکائیل) بھی مر جاتے ہیں اور خود اسرافیل بھی اس کے بعد خدا کے حکم سے مر جاتا ہے [21] اور تمام چیزیں باطل ہو جاتی ہیں [22] دنیا کے فنا ہونے کے بعد زمان و مکان کا وجود باقی نہیں رہتا ہے اجل و زمان معدوم ہوتے ہیں اور سال اور لمحات نابود ہوتے ہیں [23] اور خداوند واحد قہار کے علاوہ کوئی چیز باقی نہیں رہتی ہے

ایک بار پھر بج جائے گا اور تمام اہل آسمان اہل زمین زندہ ہوں گے[24] اور تمام اشیاء پھر سے اپنے وجود میں پلٹ کر آئیں گی، اسی طرح، جیسے ان کے خالق نے انہیں خلق کیا تھا[25]

ان آیات و روایات کے مجموعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمان، زمین اور برزخ اور جو بھی ان میں موجود ہے، حتی کہ پروردگار عالم کے مقرب فرشتے بھی دو نفخہ کے ہولناک اور

خوفناک حوادث، یعنی وسیع اور عالم گیر موت اور حضور وحشر یعنی سب کے پھر سے زندہ ہونے سے بچ نہیں سکتے ہیں اور یہ حادثہ ان سب کو اپنی لپیٹ میں لے گا

لیکن اس عظیم اور ہولناک حادثہ کے بارے میں بیان شدہ آیات و روایات کے علاوہ اور بھی کئی آیات وروایات پائی جاتی ہیں جو مذکورہ مطالب کے علاوہ، بعض ایسے بندوں کے اوصاف اور تفصیلات بیان کرتی ہیں جو دو نفخہ کے نتیجہ میں رونما ہونے والے خوفناک، سخت اور نا قابل برداشت رنج و الم سے بھرے حوادث سے مستثنیٰ قرار پائے ہیں اور ان حوادث سے محفوظ امن و امان میں اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں

دوسرا حصہ:

قرآن مجید اور روایات میں مذکورہ اشخاص کی تشریح وتوصیف یوں کی گئی ہے:

۱لف) نفخہ اول (مارنے) سے متعلق دو آیتوں میں (یعنی سورہ زمر کی آیت نمبر ٦٧ اور سورہ نمل کی آیت نمبر ٨٧) یہ بیان کرنے کے بعد کہ صور پھونکے جانے کے سبب جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہیں، فزع اور صعق سے دو چار ہوں گے، عبارت اِلَّا مَنۡ شَآءَ اللّٰہُ ط مگر وہ لوگ جنہیں خدا نے چاہا ہے کے ذریعہ بعض لوگوں کو اس نفخہ سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے اور اس استثناء کی سورہ نمل کی آیت نمبر ٨٩ اور ٩٠ تفسیر کرتے ہوئے فرماتی ہیں: وہ صاحب حسنہ (نیکی) ہیں

ب) اسی طرح، جو آیات نفخہ حیات کو بیان کرتی ہیں، مثال کے طور پر، سورہ زمر کی آیت نمبر ٦٨ اور سورہ یسن کی آیت نمبر ٥٣، سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ نفخہ موت کے سبب مر گئے، اور وہ جو دوسرے نفخہ کے سبب زندہ ہوکر خدا کے حضور محشور ہوں گے، لیکن اس کے باوجود خداوند متعال سورہ صافات کی آیت نمبر ١٢٧ اور ١٢٨ میں اپنے مخلص بندوں کو ان محشور ہونے والوں سے مستثنیٰ قرار دیتا ہے

اس لئے جو افراد صاحب حسنہ (نیکی) اور خداوند متعال کے مخلص بندے ہیں، وہ مذکورہ دو نفخہ کے نتیجہ میں رونما ہونے والے حوادث سے مستثنیٰ اور محفوظ ہیں ان دو الفاظ (حسنہ و مخلصین) کے معنی معلوم ہونے کے بعد ہم ان افراد کو واضح طور پر پہچان سکتے ہیں اس لئے ہم ان آیات و روایات پر تحقیق کرتے ہیں تا کہ مذکورہ دو الفاظ کے معنی کی تفسیر کی جائے

۱ حسنہ سے مراد حسنہ مطلق ہے، یعنی وہ حسنہ (نیکی) جو کسی بھی قسم کے گناہ سے مخلوط نہ ہو اور جو افراد حسنہ مطلق کے حامل ہیں، وہ اہل ایمان میں سے خاص افراد ہیں اور ان کی ذات ہر آلودگی سے پاک و پاکیزہ ہے اور وہ ہر قسم کے نفاق، کفر اور شرک سے منزہ ہیں انہوں نے کبھی اپنے دل کو غیر خدا کے حوالہ نہیں کیا ہے اور اپنے تمام امور کو اسی کے سپرد کر کے تسلیم و توکل محض کے مقام پر فائز ہوئے ہیں، بلکہ وہاں، سے بھی عبور کر کے کسی قسم کے تکبر، ہستی اور فرعونیت کا اظہار کئے بغیر فنا فی اللہ ہو چکے ہیں یہ خصوصیات مقام و لایت کو بیان کرتی ہیں اسی لحاظ سے آیت میں ذکر ہوئے حسنہ کو روایات میں امیر المؤمنینؑ کی ولایت، [26] ولایت کی معرفت اور اہل بیتؑ کی محبت سے تعبیر کیا گیا ہے اور سیئہ کو ولایت کا انکار اور اہل بیتؑ کی نسبت بغض سے تعبیر کیا گیا ہے [27]

۲ مخلصین سے مراد وہ لوگ ہیں جو آیہ شریفہ: فبعزتک لاغوینھم اجمعین الاعبادک منھم المخلصین [28] کے مطابق تمام انسانوں سے ممتاز ہیں، شیطان کے توسط سے اغوا ہونے سے بچ نکلے ہیں چونکہ، سورہ ابراہیمؑ کی آیت نمبر ۲۲ کے مضمون کے مطابق، انسان شیطان کے جھوٹے وعدوں کو قبول کرنے سے اغوا ہوتا ہے اور دوسری طرف اس کے ان وعدوں کو قبول کرنا شرک و گمراہی کا نتیجہ ہے البتہ مخلصین ایسے بندے ہیں جو ہر قسم کے شرک سے پاک و منزہ ہیں اور صرف خدا کے لئے مخلص ہیں

مذکورہ دو الفاظ کے مفہوم پر توجہ اور غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں الفاظ

حقیقت میں ایک معنی رکھتے ہیں اس لئے جو افراد دو نفخوں، موت اور حیات، کے حوادث سے مستثنی قرار پائے ہیں ان کی یوں توصیف کی جاسکتی ہے: وہ ایسے انسان ہیں، جو کسی صورت میں غیر خدا کا کوئی وجود نہیں دیکھتے ہیں اور اس کے علاوہ کوئی نام ونشان نہیں پاتے ہیں اور وہ اپنے فائدہ، نقصان، موت اور حیات کے لئے کسی اختیار کے قائل نہیں ہیں اور ان کی حقیقت خداوند متعال کی ذات میں غرق، تحلیل اور فانی ہوچکی ہے اور وہ اپنے تمام امور کو خداوند متعال کے سپرد کر چکے ہیں اور ان سے کوئی چیز صادر نہیں ہوتی ہے، بجز وہ چیز جس میں رضائے الٰہی ہو (نوافل) اور وہ صرف رضائے الٰہی کی تلاش میں ہیں اس لئے خداوند متعال ان کی آنکھ، کان، ہاتھ، زبان اور دل بن گیا ہے [29] اور ہر قسم کے غلو سے منزہ ہوکر وہ خدا کے مکمل مظہر بن چکے ہیں اور صرف اس کی تجلی بن چکے ہیں حقیقت میں وہ وہی وجہ اللہ ہیں، یعنی وہ باطنی اور حقیقی چہرہ جس سے ہر چیز کی مکمل شناخت صرف اسی کے ذریعہ ممکن ہے اور ان بندوں کا وجہ اللہ ہونا اس معنی میں ہے کہ وہ خداوند متعال کی مکمل ترین آیت اور اس کے مظہر کا مکمل آئینہ ہیں کہ خداوند متعال فرماتا ہے: کل شئی ہالک الا وجہ یعنی اس کے چہرہ کے علاوہ ہر چیز فنا ہونے والی ہے [30] اس لئے جبکہ تمام چیزیں اور مخلوقات (آسمان، زمین، اہل زمین، اہل برزخ اور اہل آسمان، یعنی ملائکہ و... حتی کہ ملائکہ مقرب بھی) پہلے نفخہ کے نتیجہ میں فنا ہوں گے، لیکن وہ لوگ باقی رہیں گے زوال و نابودی ان کی حقیقت سے دور ہے کیونکہ ان کی ہستی خداوند متعال میں فنا ہوچکی ہے اور ان کے لئے خداوند متعال کے وجود اور اس کے چہرہ کے علاوہ کوئی اور وجود باقی نہیں رہا ہے، نہ برزخ میں رکتے ہیں اور نہ قیامت میں ان کے لئے حساب و کتاب اور سوال و جواب کے لئے کوئی حشر ہے، کیونکہ وہ اس سے پہلے دنیا میں خدا کی راہ میں مجاہدت، مراقبت اور ریاضت کے سبب، تمام مادی تعلقات اور مثالی صورتوں اور برزخی قالبوں سے رہائی پاچکے ہیں اور اپنا سب حساب و کتاب چکا کر اور

براہ راست ذات حق کی بہشت اور لقاء اللہ کے مقام تک پہنچ چکے ہیں یہ وہ امن وسلامتی کی جگہ ہے کہ جس میں راہ پانے والے امن و امان اور اطمینان سے زندگی بسر کر تے ہیں [31]اس لئے یہ ہر حوادث کے خطرہ سے بالاتر اور موت وحیات کے ان دو عظیم نفخوں سے بھی محفوظ ہیں کیونکہ اس عظیم حادثہ کا نتیجہ وہی تمام موجودات کو اپنی قابلیت کے مطابق حیات عنداللہ سے بہرہ مند کرنا ہے، جبکہ یہ بندے اس سے مکمل تر اور بلند تر حیات کے مقام پر دنیا میں ہی فائز ہو چکے ہیں جو نفخہ صور کے سبب دوسروں کو ملے گی

مذکورہ مطالب پر غور کر نے سے معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت میں وہ موتوا قبل ان تموتوا کے مکمل مصداق ہیں اور وجہ اللہی وجود کے سبب قیامت میں ان کا حشر وحضور بھی دوسرے موجودات کی نسبت متفاوت ہے اس طرح کہ وہ وہاں پر حاضر تمام موجودات کا احاطہ کر رہے ہوں گے

ان بندوں کے مکمل اور حقیقی مصداق چودہ معصومینؑ ہیں، کیونکہ روایت میں حسنہ،[32] وجہ اللہ [33]، اسمای حسنی [34]اور آیت کبری [35] جیسے اوصاف پیغمبر اسلامصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل بیت اطہارؑ پر منطبق ہو تے ہیں لیکن انبیاء اور اولیائے الٰہی اور وہ انسان جو اہل بیتؑ کی معرفت اور محبت رکھتے ہوں ان سے دشمنی اور بغض سے منزہ و پاک ہوں اور ان کی ولایت کے بارے میں اپنی وجودی ظرفیت اور تلاش وکوشش کے مطابق، ادنی مراتب میں، ان بندوں کے مصداق ہیں، اور ہوں گے

آخر میں یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ اس ہولناک حادثہ کے بارے میں اس کی عظمت وسعت اور اہمیت کے پیش نظر اس تحریر کے علاوہ ایک تفصیلی تالیف کی ضرورت ہے اس لئے تجویز کی جاتی ہے کہ جو کتابیں اس سلسلہ میں تالیف ہوچکی ہیں ان کا مطالعہ کیا جائے تا کہ خدا کے لطف وکرم سے اس عظیم حادثہ کے بارے میں مزید اسرار کا انکشاف ہوجائے

حواشی

[1] سورہ زمر۔ ٨

[2] سورہ انعام۔ ٢

[3] سورہ نحل۔ ٩٦

[4] نمل۔ ٨٧، زمر۔ ٦٨، حاقہ۔ ١٥۔ ١٣، و...

[5] یس۔ ٥٣

[6] نازعات۔ ١٣و١٤

[7] عبس۔ ٣٣و٣٤

[8] مدثر۔ ١٠۔ ٨

[9] ملاحظہ ہو: حیات پس از مرگ۔ ص ٤٩ و ٥٠

[10] حاقہ۔ ١٥ ١٣

[11] انبیاء۔ ١٠٤

[12] زمر۔ ٦٧

[13] نازعات۔ ٦ و۔ ٧، زمل۔ ١٤، حج۔ ١ و ٢، تکویر۔ ٣ و ٤ و ٦، قارع۔ ٥، قیامہ۔ ٩ و ٧، تکویر۔ ١، انفطار۔ ٢، و...

[14] نمل۔ ٨٧

[15] زمر۔ ٦٨

[16] نور الثقلین، ج ٣، ص، ٢٥٤

[17] لقالی الاخبار، ج ٤، ص ٢٥٢

[18] مؤمنون، ١٠٠

[19] ملاحظہ ہو: حیات پس از مرگ، ص ٥١

[20] زمر، ٦٨، یس ٥١ و ٥٣، کہف، ٩٩، طہ، ١٠٢، نبا، ١٨، ق، ٢٠ و ٤٢، و...

[21] کافی، ج ٣، ص ٢٥٦

[22] احتجاج، ج۲، شمارہ ۲۲۳، ص۲٤٥

[23] نہج البلاغہ، خ۱۸٦، بند ۲۹

[24] کافی، ج۳، ص۲٥٦

[25] احتجاج، ج۲، شمارہ ۲۲۳، ص۲٤٥

[26] تفسیر قمی، بحار ج۷، ص۱۱۷ و ۱۷٥، ج۲٤، ص٤٥

[27] حاکم حسکانی، شواہد التنزیل، ج۱، ص٤۲٦، کافی، ج۱، ص۱۸٥، ح۱٤

[28] ص، ۸۲ و ۸۳

[29] کفی، ج۲، ص۳٥۲، (حدیث قرب نوافل)

[30] ملاحظہ ہو: اشارہ: روی زمیں پر اشیاء کی فنا (تفسیر آیہ ۲٦ سورالرحمن)، س: ۱٦۲

[31] فجر، ۳۰ ۲۷

[32] بحارالانوار، ج۷، ص۱۱۷ و ۱۷٥ و ج۲٤، ص٤٥

[33] بحارالانوار، ج٤، ص۷٥، ج۲٤، ص۱۱٦ ۱۱٤

[34] بحارالانوار، ج۲٥، ص٤، ح۷

[35] بحارالانوار ج۲۳، ص۲۰٦

کیا انسان میں برزخ اور قیامت کی نعمتوں اور عذاب کو درک کرنے کی توانائی ہے؟

مختصر جواب

اس سوال کے اجمالی جواب کے لئے پہلے حسب ذیل چند مطالب بیان کرنا ضروری ہیں:

۱۔ ادراک اور معرفت حقیقت کی آگاہی حاصل کرنے یا حقیقت تک پہنچنے کی راہ پیدا کرنے کے معنی میں ہے۔

۲۔ انسان اس ادراک و معرفت کو چار طریقوں سے حاصل کرسکتا ہے:

۱لف) حس کا طریقہ

ب) عقل کا طریقہ

ج) دل اور قلب کا طریقہ یعنی تہذیب وتزکیہ کا طریقہ

د) وحی اور کتاب الہی کا طریقہ۔

۳۔ معرفت شناسی کے مطابق، حس کا طریقہ معرفت کی کمزورترین راہ ہے اور اس کے بعد عقل کی راہ ہے اور اس کے بعد قلب کی راہ ہے اور ان سب میں بلندترین راہ وحی پر مبنی معرفت ہے۔

٤ ۔عقلی معرفت، ثابت حقائق کے بارے میں مفہومی علم ہے اور حقیقت تک پہنچنے اور اس کا ادراک کرنے کے طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے۔

٥ ۔ ہمارے ادراک کا متعلق (مدرک) یا ایسی مخلوقات ہیں جو مقدار و اندازہ رکھتی ہیں، لیکن مادی نہیں ہیں (مجرد مثالی) اور یا ایسی مخلوقات و معقولات ہیں، جو اندازہ و مقدار بھی نہیں رکھتی ہیں (مجرد عقلی)

٦ ۔قرآن مجید کے مطابق عقل ایک حجت الٰہی ہے۔ جو بعض معارف اور حقائق کو ادراک کرتی ہے اور دین اسلام اس کے ادراکات کو معتبر اور قابل قبول جانتا ہے۔

٧ ۔قلبی معرفت، جسے شناخت شہودی بھی کہتے ہیں، میں انسان ایسے حقائق کو دیکھتا ہے یا سنتا ہے کہ دوسری مخلوقات اس قسم کی معرفت سے محروم ہیں۔ جو شخص تزکیہ نفس اور دل کی تطہیر کی راہ سے اپنی معرفت کے سفر کا آغاز کر کے اسے منزل مقصود تک پہنچاتا ہے، وہ اسرار عالم، ملک، ملکوت اور جبروت کی معرفت حاصل کرنے پر قادر ہوتا ہے اور مشاہدات الٰہی کی منزل تک پہنچ جاتا ہے۔

مذکورہ مطالب، ہمیں اس نتیجہ پر پہنچاتے ہیں کہ: ہماری عقل برزخ کی بعض نعمتوں اور عذاب کو ادراک کرنے کی طاقت رکھتی ہے، لیکن اس معنی میں نہیں کہ وہ مکمل طور پر حقائق کی ماہیت اور اصلیت کا ادراک کر سکے ۔اس کلام کا لازمہ بھی عقل کے انکار کا سبب نہیں بن سکتا ہے، بلکہ عقل اپنے ادراک کے بہت سے مواقع پر وحی کی محتاج ہے، من جملہ غیبی اور برزخی امور کے سلسلہ میں ان کی کیفیت کی معرفت حاصل کرنے کے لئے وحی سے مدد ملتی ہے۔

مذکورہ سوال کے بارے میں، عقل کے توسط سے برزخی نعمتوں اور عذاب کی معرفت کے ادراک کی طاقت خواب میں مجرد اور مثالی امور کے ادراک کے مانند ہے کہ

حقیقت میں قابل ادراک ہے اور اس کے آثار ونتائج ناقابل انکار ہیں۔

۸۔ عالم ہستی کی دو قسمیں ہیں: محسوس (شہود) اور نامحسوس (غیب) عالم غیب کے ایک حصہ تک انسان کی رسائی ہوتی ہے۔

۹۔ آیات وروایات میں بہت سے ایسے مطالب پائے جاتے ہیں جن سے بعض ایسی نعمتوں اور عذاب کے بارے میں معلوم ہوتا ہے کہ نہ کسی آنکھ نے انہیں دیکھا ہے، نہ کسی کان نے انہیں سنا ہے اور نہ کسی قلب نے ان کے تصور کا احساس ہے۔

تفصیلی جواب

مذکورہ سوال کا تفصیلی جواب، مندرجہ ذیل چند مطالب کے بیان سے واضح ہوگا:

ادراک ومعرفت کی تعریف:

ادراک ومعرفت، بدیہی اور ناقابل تعریف مفاہیم میں سے ہے، اس دلیل سے کہ ہم تمام چیزوں کو علم سے پہچانتے ہیں۔ اگر ہم علم وادراک کی علم سے تعریف کرنا چاہیں، تو یہ دو تعین کنندہ دور پر مشتمل ہوگا اور اگر غیر علم سے علم وادراک کی تعریف کرنا چاہیں تو، ضروری ہے کہ پہلے ہم اس غیر علم کو جان لیں، اس کے بعد علم کو اس کے توسط سے پہچان لیں، یہ تعریف بھی اسی تعین کنندہ دور کے مانند ہے۔

پس جو کچھ معرفت یا علم کی تعریف میں کہا جاتا ہے، حقیقی تعریف نہیں ہے، بلکہ انتباہی تعریف ہے۔ یعنی مخاطب کے ذہن میں جو مطلب موجود ہے، لیکن اس کے انتباہ کا سبب نہیں ہے، اس کو مشابہ الفاظ اور مساوی کلمات کے ذریعہ اس کے ذہن میں ارتکاز شدہ معنی کو برجستہ اور نمایاں صورت میں ظاہر کیا جائے۔ معرفت کے لئے بیان کی جانے والی لفظی تعریفوں میں یہ بھی ہے کہ شناخت، یعنی حقیقت کی آگاہی یا حقیقت تک پہنچنے کی راہ کو پیدا کرنا معرفت ہے۔[1]

چونکہ حقائق کی معرفت اور ان تک پہنچنا، مختلف وسائل سے انجام پاتا ہے، اور ان وسائل میں سے ایک عقل ہے، اس لئے ہم حقیقت اور عقلی ادراک تک پہنچنے کے وسائل اور راہوں کی طرف ایک مختصر اشارہ کرتے ہیں۔

معرفت حاصل کرنے کے طریقے:

معرفت حاصل کرنے کے لئے چار طریقے پائے جاتے ہیں:

(۱لف) حس کا طریقہ: یہ راہ عام لوگوں کے لئے کھلی ہے۔

(ب) عقل کا طریقہ: یہ ایک ایسی راہ ہے، جسے طے کرنے کی طاقت صرف خاص لوگوں میں پائی جاتی ہے۔

(ج) دل اور قلب کا طریقہ (تہذیب وتزکیہ کا طریقہ) یہ راہ عارفوں کے لئے کھلی ہے۔

(د) کتاب منیر اور وحی الٰہی کا طریقہ: یہ راہ انبیائے الٰہی سے مخصوص ہے۔[2]

معرفت شناسی کے مطابق، حسی معرفت کا درجہ، معرفت کے کمزورترین مراحل میں سے ایک مرحلہ ہے۔ البتہ افراد اور اصناف کے درمیان، بعض لوگوں کی معرفت دوسروں کی معرفت پر ترجیح رکھتی ہے، اسی لئے کہا جاتا ہے: شنیدن کے بود مانند دیدن[3] یعنی سننا، کبھی دیکھنے کے مانند نہیں ہوسکتا ہے۔ حسی معرفت سے بالاتر عقلی معرفت ہے جس سے فلسفہ، کلام اور دوسرے استدلالی علوم میں استفادہ کیا جاتا ہے۔ اس سے برتر معرفت کا مرحلہ قلبی معرفت ہے، یہ معرفت عرفان میں بیان کی جاتی ہے۔ اور معرفت کے کمال کی چوٹی وحی پر مبنی معرفت ہے، جو علم شہودی اور معرفت حضوری کی قسم ہے۔[4]

عقلی معرفت:

عقلی معرفت ثابت حقائق کے بارے میں مفہومی علم ہے جو عالم فطرت کے متغیر اور متحرک امور پر بھی مشتمل ہے۔ یہ علم جو حسی علم سے بلند اور وسیع تر ہے، اپنے معلوم کے مانند، مستحکم اور پائیدار رہے ہے۔علوم عقلی کے ذریعہ، علوم حصولی سے مربوط کلی مسائل کے بارے میں بہت سی راہوں کو طے کر کے گوناگوں حقائق تک پہنچا جا سکتا ہے، لیکن اس قسم کے علوم، ایسے امور کا ادراک کرنے میں عاجز اور بے بس ہیں، جو ثابت و مجرد اور عین وجود خارجی ہیں اور تشخص عینی ہیں اور یہ کہا جا سکتا ہے: کہ جس طرح، حقائق عقلی کو سمجھنے میں حسی ادراک عاجز اور ناتوان ہیں۔ [5] اسی طرح عقلی معرفت بھی اسرار الٰہی اور مشاہدات ربانی کے شہود کی معرفت حاصل کرنے میں عاجز و ناتوان ہے۔

جیسا کہ اشارہ کیا گیا، علوم عقلی کے ذریعہ علوم حصولی کے قلمرو میں کلی مسائل کو حاصل کیا جا سکتا ہے، کہ کلی مفاہیم کی پیدائش اور عقلی تفکر سے انسان اپنے باطن کو ظاہر سے مغایر برتر صورت میں پہچانتا ہے، وہ کلی مفاہیم کو غیر مادی خصوصیات میں مشاہدہ کرتا ہے۔کلی مفاہیم، نہ حقائق مکانی ہیں اور نہ امور زمانی، اور یہ امر اس بات کی دلیل ہے کہ کلیات کے لئے کسی صورت میں دماغ کے خلیوں اور اس کے مانند کہیں اور جگہ نہیں ہے ۔ برتری کی معرفت جو انسان کی اشیاء کو معرفت کی طویل راہ میں حاصل ہوتی ہے، اسے فطری حقائق کی کلی معرفت کے علاوہ تجرد نفس اور اس سے بالاتر، بلند حقائق کی معرفت حاصل کرنے کی قدرت بخشتی ہے، جو فطری اور نفسانی امور کا مبداء و معاد ہے۔ بوعلی سینا نے بھی اشارات کے آٹھویں باب میں معنوی معاد کو ثابت کرنے کے لئے روز مرہ زندگی کے مشاہدات کے رو سے کوشش کی ہے اور عقلی لذتوں کو ثابت کیا ہے اور اس طرح انسان کی ابدی سعادت کو

استنباط اور ثابت کیا ہے۔

لہٰذا عقلی معرفت کے قائل ایک مفکر کی نظر میں فطری دنیا ایک آیت اور علامت ہے، جو نہ صرف اسے اس پر حاکم ثابت وابدی قواعد سے استنباط کرنے کا قادر بناتی ہے بلکہ اسے انسان کے تجرد اور اس کے مبداء و معاد سے بھی آشنا کراتی ہے۔

قلبی معرفت، جو شہودی معرفت ہے، میں انسان اپنی آنکھوں سے کچھ ایسے حقائق کا مشاہدہ کرتا ہے اور اپنے کان سے ایسے کلمات سنتا ہے، جن کو دیکھنے اور سننے سے دوسرے محروم ہیں۔ اس مرحلہ پر فائز افراد مختلف اشیاء کا مشاہدہ کرنے اور مختلف امور سے مواجہ ہونے کے نتیجہ میں گونا گون مناظر کا مشاہدہ کرتے ہیں اور مختلف آوازوں کو سنتے ہیں، جن کے بارے میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔

معرفت کا متعلق:

معرفت کا متعلق، ایک کلی تقسیم میں تین حصوں پر مشتمل ہے:

الف: عالم فطرت: یہ وہ عالم ہے، جسے ہم حس سے ادراک کرتے ہیں۔

ب: عالم مثال: وہ عالم ہے جو ماورائے فطرت مشاہدہ ہوتا ہے۔ اس عالم کی مخلوقات ایسے حقائق ہیں جو مقدار اور اندازہ پر مشتمل ہیں، لیکن مادی نہیں ہیں۔ سچے خواب اور نیند کی حالت میں انسان کو مشاہدہ ہونے والے واقعات، اس عالم کے نمونے اور مثالیں ہیں، اگرچہ یہ عالم انسان کے ذہن وخیال سے جدا ایک حقیقی دنیا ہے، اور یہ خواب وخیال نہیں ہوسکتا ہے۔

ج: عالم عقل: عالم عقل ومعقولات کی مخلوقات، اجمالی حقائق ہیں، بدون اس کے کہ ایک خاص اندازہ، مقدار اور کسی مخصوص مادہ سے مربوط ہوں، یہ تمام فطری ومثالی افراد پر مشتمل ہیں اور ان سب پر اطلاق ہوتے ہیں۔ لیکن عالم مثال وعقل کے ثبوت کا طریقہ

انسان میں مرحلہ تخیل و تعقل کے ثابت ہونے کے بعد ممکن ہے۔ اس بحث کی تفصیل بیان کرنے کی یہاں پر گنجائش نہیں ہے۔

قرآن مجید اور روایات کی روشنی میں حقائق کی معرفت کے سلسلہ میں عقل کے اعتبار کی حد:

قرآن مجید اور معصومین علیہم السلام کی روایتوں نے، بعض برتر معارف و حقائق کی شناخت

میں انسان کو ناتواں سمجھا ہے، اسے نہ صرف انسان کی سعادت کے لئے ناکافی نہیں جانتا ہے، یہاں تک کہ ان تمام علوم کے فہم و ادراک کا فاقد جانتا ہے، جن کا انسان دنیوی زندگی کی تدبیر کے لئے محتاج ہے۔ [6] اس لئے وحی اپنی تعلیمات کے ایک حصہ میں انسان کی عقل کی نسبت تائیدی اور ہدایتی کردار کی حامل ہے اور دوسرے حصہ میں کچھ ایسے حقائق کا اظہار کرتی ہے کہ عام انسان کی عقل وفہم کے لئے وحی کی پیروی کے بغیر ان تک رسائی کی کوئی راہ نہیں ہے، جیسے برزخ و قیامت میں شریعت کے اقتصادی سیاسی اور عبادی احکام کے آثار کا ظاہر ہونا یا قیامت میں موجود مختلف مقامات کے مانند، جن کے بارے میں قرآن مجید کی آیات و روایات خبر دیتی ہیں۔

مذکورہ مطالب بیان کرنے سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ انسان کے عقلی و حسی ادراکات کو وحی اور دین نہ صرف ان کا انکار نہیں کرتے ہیں، بلکہ قیامت میں واقع ہونے والے حوادث کی غیبی خبر بھی دیتے ہیں اور انسان کی عقل کے ان ضوابط، حدود اور قواعد کی بھی خبر دیتے ہیں جن کے تحت وہ گامزن ہوتا ہے۔ اس کے ضمن میں عقلی علوم کو ثمر بخش بنانے کے لئے مکاشفات کے مفہوم کی اطلاعات فراہم کر کے الٰہی ہدایت کے تحت عقلانی فیصلوں کے لئے امکانات فراہم کرتے ہیں۔

عقل کا دینی اعتبار اس امر کا سبب بن گیا ہے کہ ادراک ومعرفت کے سلسلہ میں عقل ایک حجت الٰہی بن کر قابل احترام واعتبار قرار پائی ہے۔

نتیجہ کے طور پر عقلی وضاحتیں اور واقعات بھی بعض دینی وضاحتوں کے عنوان سے قابل اعتبار قرار پائی ہیں اور اس لحاظ سے دینی اظہارات، حتی جب غیب کی خبر دیتے ہیں، اگر چہ ماورائے عقلانی حقائق پر مشتمل ہوں، ہرگز عقل کے مخالف نہیں ہیں اور عقل یا عقلی نتائج سے تضاد نہیں رکھتے ہیں۔[7]

تمام شیعہ، مسلمان دانشور، عقل کو بعض معارف کی شناخت میں معیار بعض حقائق کی شناخت میں مصباح و چراغ اور بعض موارد میں مفتاح وکلید جانتے ہیں۔

عقل کی کلید ہونے کا مراد یہ ہے کہ: عقل جب مصباح کی صورت میں قوانین وقواعد وضوابط کی شناخت کے سلسلہ میں اپنا فریضہ انجام دیتی ہے اور اپنی ہستی کے افق پر احکام شریعت کو کلی مفاہیم کی صورت میں مجرد وثابت کرنے کے بعد شرح کی حدود میں مداخلت نہیں کرتی ہے۔ مثلا احکام الٰہی کے انکشاف اور شناخت کے بعد، عقل ان کے سلسلہ میں اسرار کی تحقیق کرنے کی توانائی نہیں رکھتی ہے، کیونکہ ان احکام کے اسرار عالم غیب سے مربوط ہیں اور عقلی استنباط کے دائرہ سے خارج ہیں، اور عقل، عالم غیب کے بعض کلیات کے علاوہ کچھ نہیں جانتی ہے۔[8]

غیب وشہود کی معرفت کا معیار:

عالم ہستی کی مخلوقات دو قسم کی ہیں: محسوس اور نامحسوس، محسوس مخلوق کی شناخت کا معیار احساس وتجربہ ہے۔ تجربہ اگر چہ اپنے حدود میں معتبر اور قابل قدر ہے، لیکن اس کا اعتبار عقل کے اعتبار کے طول میں ہے نہ اس کے عرض میں، کیونکہ تجربہ کا مراد، استقراء اور مکرر حس

نہیں ہے، بلکہ تجربہ، ایک ایسا مکرر حس ہے جو ایک مخفی قیاس کی پناہ میں مفید یقین ہوتا ہے، اور ہر قیاس ہمیشہ، کبریائی کلی کا حامل ہے، جو (عادی یا مسلح) حس سے قابل ادراک نہیں ہے اور عقلانی تفکر کے بغیر قابل سمجھ نہیں ہے ۔ غیر محسوس اور غیب کے عالم کی دو قسمیں ہیں: مطلق اور تناسبی ۔ غیب وہ مطلق ہے جو وجود کے تمام مقامات پر اور عام لوگوں کے لئے پوشیدہ اور مخفی ہے۔ غیب تناسبی وہ ہے کہ وجود کے بعض مواقع یا بعض افراد کے لئے غیب ہے۔

غیب مطلق، جیسے، خدا وند متعال کی ذات کی حقیقت، جو لامتناہی ہے، علم حصولی ومفہومی اور علم حضوری وشہودی قلبی سے قابل شناخت ومعرفت نہیں ہے، بلکہ اس کے بارے میں صرف علم اجمالی اور اسی طرح اس پر فی الجملہ اعتقاد، ممکن ہے نہ بالجملہ۔

لیکن غیب تناسبی، جیسے، اسلاف کے بارے میں خبریں یا قیامت اور فرشتوں وغیرہ کے بارے میں معلومات، ان کی شناخت کا معیار عقلی برہان اور قلبی مشاہدات ہیں، اور قرآن مجید کی طرف سے تفکر و تعقل پر تاکید، اس لئے ہے کہ شناخت کا پہلا معیار، عقل شمار ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر عقل حاکم ہو جائے، تو برتر شناخت یعنی وحی کو بھی قبول کرتی ہے اور قلبی شہود کی بھی تائید کرتی ہے اور ادراک حسی کی بھی ہدایت کرتی ہے۔[9]

برزخ کے لغوی اور اصطلاحی معانی: برزخ دو چیزوں (مادہ وروح) کے درمیان حد فاصلہ، حائل اور واسطہ کے معنی میں ہے اور عالم مثال کو اس لئے عالم برزخ کہتے ہیں کہ اجسام کثیفہ (مادی) اور عالم ارواح مجردہ کے درمیان حد فاصلہ ہے اور دنیا وآخرت کے درمیان حد فاصلہ ہے۔ لفظ برزخ کو دو مواقع پر استعمال کیا جاسکتا ہے: ایک عالم برزخ کے سلسلہ میں ایک ایسی جگہ ہے، جہاں بدن سے جدا ہونے کے بعد ارواح اس جگہ میں منتقل ہوتے ہیں اور دوسرا، ارواح مجردہ اور اجسام کے درمیان حد فاصلہ۔[10]

کیا انسان عالم غیب کی شناخت کی توانائی رکھتا ہے؟ اس سوال کے جواب میں کہا

جاسکتا ہے کہ اگر شناخت اور ادراک کا مراد، مفاہیم وتصورات ومسائل نظری کا ادراک عقلی ہے،تو اس قسم کا امر،معرفت کی شناسائی کی بحث میں ثابت شدہ اصول کے مطابق، ایک ممکن امر ہے، یہاں پر اس کی تفصیل بیان کرنے کی گنجائش نہیں ہے ۔لیکن اگر ادراک کا مراد،شہودی اور قلبی ادراک ہو،تو یہ ادراک بھی دوسرے جہات سے سلوک عملی کے اصولوں کی رعایت کرتے ہوئے اور ان پر عمل کرنے کی صورت میں ممکن ہے۔اور انسان ایک ایسے مر حلہ میں داخل ہوسکتا ہے جہاں پر وہ دوسرے عالم کے شہودی ادراک کی ظرفیت پیدا کرسکتا ہے۔

نظام ہستی میں مختلف عالم ہیں، ان میں سے ہرایک کے الگ احکام ہیں۔ عالموں کے درمیانی تفاوت کے پیش نظر یہ احکام ایک دوسرے سے فرق رکھتے ہیں،مثلا عالم ناسوت یا فطرت کے اپنے مخصوص احکام ہیں اور عالم برزخ کے اپنے خاص احکام ہیں اور عالم قیامت کے آثار اس سے مخصوص ہیں ان عالموں میں داخل ہونے اور ان کے بارے میں شہودی ادراک حاصل کرنے کے لئے انسان میں ایک قسم کی تبدیلی ایجاد ہونی چاہئے تا کہ اس میں اس کی ظرفیت اور صلاحیت پیدا کر سکے ۔اسی لئے انسان میں مرنے کے بعد ایک قسم کی تبدیلی ایجاد ہوتی ہے تا کہ وہ عالم برزخ میں داخل ہوسکے ۔اس کے علاوہ قرآن مجید کی آیات کے مطابق مجموع عالم میں ایک بنیادی تبدیلی آنی چاہئے تا کہ عالم قیامت کے احکام وآثار کو ادراک اور قبول کرنے کی آمادگی پیدا ہو سکے۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ انسان، عالم غیر مادی کو ادراک کرنے کی ظرفیت رکھتا ہے،لیکن اس شرط پر کہ تغیر وتبدل کے نتیجہ میں یہ قابلیت حاصل کر سکے۔ چنانچہ بعض انسانوں کو ایک قسم کے اعمال وآداب انجام دینے اور سیر وسلوک کی وادی میں قدم رکھنے کے سبب اسی دنیا میں موت اور قیامت سے پہلے بلند تر عالم کے ادراک کی ظرفیت اور صلاحیت حاصل ہوتی ہے،جس کے نتیجہ میں ان پر بہت

سے حقائق واضح ہوتے ہیں۔ جو تزکیہ نفس اور تطہیر دل کی راہ سے اپنے سفر کا آغاز کرتا ہے، وہ کچھ منازل اور مراتب طے کر کے بلند مقامات پر پہنچتا ہے۔

ایسا شخص، پہلے مرحلہ میں عالم ملک کے اسرار سے آگاہ ہونے کا مرتبہ حاصل کرتا ہے ...اس سے بھی بلندتر مرتبہ پر وہ عالم جبروت اور عرش الٰہی کا مشاہدہ کرنے کی شائستگی اور قابلیت پیدا کرتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے، جس پر حارثہ بن مالک جیسے افراد فائز ہو چکے ہیں، جس نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس سوال کے جواب میں کہ، تم نے رات کو کس حالت میں صبح کی؟ اس نے جواب میں کہا: کانی انظر الی عرش الرحمن بارزا گویا کہ میں عرش خدا کا آشکار صورت میں مشاہدہ کر رہا ہوں۔[11]

کیا انسان کی عقل عالم برزخ وقیامت اور ان کی نعمتوں اور عذاب کو ادراک کرنے کی توانائی رکھتی ہے؟ اس کے جواب میں کہنا چاہئے: ہستی کے بہت سے حقائق خاص کر وہ حقائق جو عالم فطرت کے ماورا میں موجود ہیں، ہمارے لئے مجہول ہیں، البتہ یہ نہ جاننا، اکثر ان حقائق کی اصل کو عقل اور اور وحی نے اپنی جگہ پر ثابت کیا ہے اور ہم اس کی نسبت آگاہی رکھتے ہیں۔لیکن ان کی حقیقت اور ماہیت کے بارے میں علم بہت محدود ہے، مگر ایسے بہت کم لوگوں کے لئے جنہوں نے علمی سیر وسلوک سے اسی دنیا میں اس عالم کی طرف راہ پیدا کی ہے اور ان کا اجمالی علم، تفصیلی علم میں تبدیل ہوا ہو، اوراس لئے برزخی بدن کی ماہیت اور ... برزخ کی نعمت اور عذاب ہمارے لئے مکمل طور پر واضح نہیں ہیں۔ اس کے باوجود آیات و روایات اور عقلی تجزیوں سے، برزخی بدن کی کیفیت اور برزخ و قیامت کی نعمتوں اور عذاب کے بارے میں بعض پس منظر پیش کئے جاسکتے ہیں۔[12] اگر ہم عالم برزخ اور اس کے عذاب اور نعمتوں کا خاکہ کھینچنا چاہیں تو ہم انہیں خواب کی حالت میں حاصل ہونے والی لذتوں اور نعمتوں سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ انسان خواب کے عالم میں

بعض کام انجام دیتا ہے، چلتا ہے، گفتگو کرتا ہے، غور فکر کرتا ہے ... اگر ہم انسان کے ان کاموں کا مادی زندگی سے موازنہ کریں، تو یہ فاقد حقیقت ہوں گے، لیکن اگر موازنہ سے صرف نظر کریں، تو ہمیں کہنا چاہئے، کہ یہ کام خواب کی ظرفیت میں بذات خود ایک حقیقت ہیں، کیونکہ خواب کی خوشی، آرام، آلام اور درد بذات خود خلاف حقیقت نہیں ہیں، اور ممکن ہے خواب میں رونما ہونے والے حالات انسان کے جسمانی بدن پر بھی اثر انداز ہو سکیں، اب اگر اس قسم کے خواب کی زندگی حقیقت میں تبدیل ہو جائے، تو اس کا نام برزخی اور مثالی زندگی رکھنا چاہئے۔ وہاں پر مادہ، عنصر، مالکیول اور ایٹم کا وجود نہیں ہے، لیکن کائنات کی تمام مخلوقات کی صورتیں، مادہ اور وزن کے بغیر موجود ہیں، مثلاً عالم تصور میں، ہم تمام دنیا اور چیزوں کا تصور کر سکتے ہیں، اور ان سب چیزوں کو اپنے سامنے حاضر کر سکتے ہیں اور حقیقت میں ہم آسمان و زمین اور دوست و رفیق کی ایک تصویر کا مشاہدہ کر سکتے ہیں، اب اگر جو کچھ ہم نے خواب یا تصور کے عالم میں مشاہدہ کیا، ایک زیادہ حقیقت کے ساتھ واضح تر صورت میں تجلی کرے، تو ہمیں اس زندگی کا نام برزخی زندگی رکھنا چاہئے۔ اس لحاظ سے دانشور کہتے ہیں کہ عالم برزخ میں، مادہ کے آثار، جیسے، گرمی، سردی، شیرینی، تلخی، شادمانی اور غم موجود ہیں، اگرچہ خود مادہ موجود نہیں ہے۔ وہاں پر کھانا، پینا، سننا، سنانا، ظاہر ہونا اور دیکھنا موجود ہے، اگرچہ وہاں پر دنیا کے مانند مادہ کا وجود نہیں ہے۔[13]

جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا، قرآن مجید اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان عالم آخرت میں منتقل ہونے کے بعد ایسی نعمتوں اور عذاب سے مواجہ ہوگا جو تصور سے بالاتر ہیں اور ایمان کے درجات میں کفر و نفاق اور ظالم افراد کے مطابق فرق ہوگا، جیسے:

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ [14] پس کسی نفس کو نہیں معلوم ہے کہ اس کے لئے کیا کیا خنکی چشم کا سامان چھپا کر رکھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ پیغمبر

اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مفصل حدیث میں فرمایا ہے:... ا...[15] چنانچہ اس مضمون کا ایک حصہ امام صادق علیہ السلام کے کلام میں آیا ہے کہ:...

ومن تصدق بصدقه فی رجب ابتغاء وجه الله، اکرمه الله یوم القیامه فی الجنه من الثواب بما لاعین رات ولااذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر [16]

اس لئے خداوند متعال اپنے فضل وکرم کی بنیاد پر مومنوں کو ایسی نعمتیں عطا کرے گا جو نہ کسی کے قلب وعقل پر طاری ہوئی ہوں گیں۔

امام خمینیؒ بہشتی نعمتوں کی توصیف میں فرماتے ہیں:

میں نے ایک اہل معرفت شخص رضوان اللہ علیہ سے سنا ہے کہ وہ فرماتے تھے: بہشت میں، ایک شربت، سنی گئی تمام لذتیں مختلف قسموں میں (موسیقی اور ترانوں کی صورت میں) اور دیکھی گئی تمام لذتیں (خوبصورت انداز اور رنگوں میں) موجود ہیں، اور دوسرے حواس بھی اسی صورت میں ہوں گے، حتی... ان لذتوں کا الگ الگ صورت میں ادراک کیا جائے گا۔[17]

حواشی

[1]۔ جوادی آملی، عبداللہ، تفسیر موضوعی قرآن کریم، ج ۱۳، ص ۸۸۔۷۸۔

[2]۔ ایضا، ص ۲۱۶۔

[3]۔ لیس الخبر کالمعاینہ صدوق، من لایحضرہ الفقیہ، ج ٤، ص ۳۷۸، ح ۵۷۸۸۔

[4]۔ جوادی آملی، عبداللہ، حیات عارفانہ امام علی علیہ السلام، ص ۲۱۔

[5]۔ شریعت در آئینہ ی معرفت، ص ۱۷۹۔۱۷۸۔

[6] عقل وایمان وانسان شناسی، ص ۱٦۔

[7]۔شریعت در آئینہ ی معرفت،ص۳٦۸۔

[8]۔شریعت در آئینہ ی معرفت،طبق نقل،عقل و ایمان و انسان شناسی،ص۱۸۔

[9]۔ملاحظہ ہوتسنیم، ج۲،ص۱۷۳۔۱۷۱۔

[10]۔ملاحظہ ہو: سید جعفر سجادی، فرہنگ علوم فلسفی وکلامی،طبع ۱۳۵۷، نشر طوبی یا دائرہ المعارف لغات قرآن۔

[11]۔جوادی آملی،عبداللہ، شناخت شناسی،ص۴۱۰۔۴۰۹۔

[12]۔محمد رضا کاشفی، خداشناسی وفرجام شناسی،ص۱۰۰۔۹۸۔

[13]۔سبحانی، جعفر، معاد انسان وجہان،تفسیر نمونہ، ج۱٤،ص۳۲۱، کاشفی، محمد رضا، خدا شناسی وفرجام شناسی،ص۹٤۔

[14]۔سجدہ،۱۷۔

[15]۔حر عالی، وسائیل الشیعہ ، ج۷، کتاب الصوم،ص۳۵۳۔

[16]۔حر عاملی، وساقیل الشیعہ ،، ج۷، کتاب الصوم،ص۳۵٤۔، حدیث۱۰۔

[17]۔امام خمینی (رحمہ اللہ)،تفسیر دعای سحر،ص٤٤۔

یہ جو کہا جاتا ہے کہ خداوند متعال آسمانوں اور زمین کا نور ہے، کیا اس نور سے مراد محسوس نور ہے؟ اگر محسوس نور نہیں ہے، تو کس معنی میں ہے؟

مختصر جواب

۱۔آیہ کریمہ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط میں مسلمانوں سے مراد حسی ومحسوس نور نہیں ہے۔ کیونکہ محسوس نور جسم پر عارض ہونے والی مادی خصوصیات و کیفات والا نور ہے، چونکہ عقلی ادلہ خداوند متعال کے لئے جسمانیت کے منافی ہیں، اس لئے خدا کے نور کو ہم محسوس نور نہیں کہہ سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ بہت سی آیات الٰہی خداوند متعال کو آنکھوں سے درک کرنے اور ہر چیز سے مثال دینے کی نفی کرتی ہیں، جو خدا کے جسمانی نہ ہونے کی قرآنی دلیل ہے اور اس لحاظ سے اگر خداوند متعال کی آسمانوں اور زمین کے نور سے تعبیر کی گئی ہے، تو اس سے مراد محسوس نور نہیں ہوسکتا ہے۔

۲۔نور ایک ایسی چیز ہے جو ظاہر بالذات اور مظہر غیر ہے۔ یعنی روشنی اور روشنی دینے والا اور پیدا اور پیدا کرنے والا ہے، خواہ محسوس نور ہو، جیسے سورج کا نور، ستاروں اور

چراغ کا نور اور خواہ غیر محسوس نور ہو جیسے علم وایمان کا نور۔

لیکن نور کے بارے میں جو ابتدائی معنی ذہن میں پیدا ہوتے ہیں، وہ وہی حسی نور ہے، تاہم نور پر دقت غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نور کے معنی وہی ظاہر بالذات ومظہر غیر ہے۔ اس کا تجزیہ کر کے امور معنوی پر نور کا اطلاق، جو روح و جان و باطن کو روشنی بخشنے والا ہے، صحیح ہوگا۔ چنانچہ قرآن مجید ایمان کو ایک ایسے نور کے عنوان سے یاد کرتا ہے، جو مومن کو عطا کیا جاتا ہے اور عرفا نے عشق کو نور سمجھا ہے۔

۳۔ چونکہ خداوند متعال کی ذات واضح اور روشن ہے اور دوسری تمام چیزوں کی روشنی کی پیدائش کا سبب ہے اور خدا وند متعال ان سب چیزوں کا خالق اور پیدا کرنے والا ہے، اس لئے لفظ نور کا اطلاق خدا وند متعال پر صحیح ہے۔ چونکہ ہر چیز کا وجود دوسروں کے لئے ظہور کا سبب ہے اس لئے کہنا چاہئے کہ نور کا مکمل مصداق وہی وجود ہے، لہٰذا، خدا وند متعال نور کا مکمل ترین مصداق ہے اور ظاہر بالذات ومظہر حقیقی وہی ہے۔ اس لئے اعتراف کرنا چاہئے کہ وہ ایک ایسا نور ہے جس کے سبب آسمان اور زمین ظاہر اور روشن ہیں۔

٤۔ آسمانوں اور زمین کی تعبیر، حقیقت میں تمام عالم ہستی اور تمام مخلوقات، غیب و شہود کا ایک کنایہ ہے، نہ یہ کہ اس سے مراد یہی ہمارے سر پر موجود آسمان ہو۔ پس اللہ نور السموات کے معنی یہ ہیں کہ: خداوند متعال پوری کائنات کا نور ہے۔

لیکن یہ کہ آیہ شریفہ میں نور کی تعبیر کی گئی ہے نہ کہ پیدا کرنے والے کی، یہ اس نکتہ کی طرف انتباہ ہے کہ جس طرح نور ظاہر ہے اور ظاہر کرنے والے کا محتاج نہیں ہے، خدا وند متعال بھی، خود ظاہر، روشن اور واضح ہے اور اس کی معرفت حاصل کرنے کے لئے واسطہ اور مظہر کے وجود کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ عرفا نے، انبیاء اور ائمہ علیہم السلام کی پیروی میں فرمایا ہے کہ مخلوقات کو خدا وند متعال کے نور کی روشنی میں پہچاننا چاہئے نہ یہ کہ خدا کو مخلوقات اور

آثار کے وسیلہ سے پہچانا جائے۔ اولیائے الٰہی کے لئے ہر چیز نور الٰہی کی روشنی میں دکھائی دیتی ہے اور اس کے نور کے سوا کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی ہے اور اگر نور الٰہی نہ ہو تو تمام چیزیں تاریکی میں نابود ہوسکتی ہیں۔ لہٰذا اس آیہ شریفہ کا اہم اسفادہ یہ ہے کہ: خداوند متعال کسی بھی مخلوق کے لئے مجہول نہیں ہے، کیونکہ تمام اشیاء کا ظہور اس کے ظہور و اظہار سے ترقی پاتا ہے۔ خداوند متعال مخفی نہیں ہے، تاکہ اس کو اس کی مخلوق کے ذریعہ پیدا کیا جائے، بلکہ وہ متجلی بہ تمام ذات ہے، ناقص معرفت رکھنے والوں کو اس کا مخفی دکھائی دینا، نور کی فرط شدت کے سبب ہوسکتی ہے یامن هو اختفی لفرط نوره الظاهر الباطن فی ظهوره

۵۔ اس آیہ شریفہ سے جو دوسرا نکتہ معلوم ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ: ہم خدا کو نور کہتے ہیں، لیکن نور اعظم اطلاق نہیں کرتے ہیں۔ مانویہ کا یہ عقیدہ کہ خداوند متعال نور اعظم ہے، یعنی ایک حسی نور جو تمام انوار کے مانند ہے، لیکن بزرگ تر و بالا تر ہے، صحیح اور حقیقی نہیں ہے۔ بلکہ قرآن مجید کے مطابق خداوند متعال نور محض ہے اور یہ نور غیر حسی ہے، یعنی صرف عالم وجود کا نور ہے، اور اس کے علاوہ ہر چیز تاریکی ہے۔ دعاؤں کی تعبیر میں نور النور ہے، یعنی حقیقی نور وہی ہے اور اگر کوئی نور ہے تو وہ نور حق کے وجود کی برکت سے ہے۔

٦۔ آیہ کریمہ کی تفسیر، تاویل اور تطبیق میں، مختلف اقوال اور روایتیں پائی جاتی ہیں، ان کی تفصیلات کے لئے سلسلہ میں تفاسیر اور روایات کے مجموعوں پر مشتمل کتابوں کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔

تفصیلی جواب

بیشک، یہ جو قرآن مجید میں خداوند متعال کے بارے میں نور کی تعبیر کی گئی ہے، اللہ نور السمور والارض[1] سے مراد ہرگز حسی نور نہیں ہے۔ محسوس نور، خدا کی مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہے، چنانچہ قرآن مجید میں سورہ انعام کی پہلی آیت میں ارشاد ہوتا ہے: ساری

تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور تاریکیوں اور نور کو مقرر کیا ہے۔

فلاسفہ، متکلمین اور مفسرین قرآن میں سے ہر ایک نے خدا کے جسم نہ ہونے کے بارے میں مضبوط اور مستحکم دلائل پیش کئے ہیں۔[2] اس لئے نور کا نام خدا پر محسوس نور کے معنی میں اطلاق نہیں ہوسکتا ہے، کیونکہ یہ جسم کے عنوان سے یا جسم اور جسم پر عارض ہونے والی خصوصیات میں سے ہے ۔ مفسرین اور متکلمین میں شاید فخر رازی نے دوسروں کی نسبت اس مسئلہ کی طرف زیادہ توجہ مبذول کی ہے اور آیہ شریفہ اللہ نور السموت والارض کی تفسیر میں، خدا کے جسمانی نہ ہونے اور اس نور کے محسوس اور جسمانی نہ ہونے کے سلسلہ میں چھ دلائل پیش کئے ہیں [3] ان میں سب سے اہم دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید میں بہت سی ایسی آیات موجود ہیں جو خدا کے حادث اور جسمانی ہونے کی نفی کرتی ہیں ۔ جو کچھ بیان ہوا، اس کے علاوہ، قرآن مجید میں کئی جگہ پر ذکر ہوئی، آیہ شریفہ لیس کمثلہ شی ء خداوند متعال کے لئے ہر قسم کی مثال اور شباہت کی نفی کرتی ہے۔ لہٰذا خدا کی نورانیت کبھی محسوس نورانیت نہیں ہوسکتی ہے، کیونکہ اس نورانیت کی بہت ساری مثالیں اور شباہتیں موجود ہیں ۔

نور کے معنی:

علامہ طباطبائی لفظ نور کے معنی کا یوں تجزیہ کرتے ہیں کہ: لفظ نور ایک معروف معنی رکھتا ہے، اور وہ عبارت ہے کہ نور تاریک اجسام کو ہمارے دیکھنے کے لئے روشن کرتا ہے، اور اس کے ذریعہ ہر چیز ظاہر اور ہویدا ہوتی ہے ۔ لیکن خود نور ہمارے لئے ذاتی طور پر واضح اور ہویدا ہے اور کوئی چیز اسے ظاہر نہیں کرتی ہے، پس نور عبارت ہے وہ چیز، جو ظاہر بالذات اور دوسری چیزوں کو ظاہر کرنے والی ہے۔

یہ پہلا معنی ہے جو لفظ نور کے لئے وضع کیا گیا ہے، بعد میں اس سے استعارہ یا

حقیقت ثانویہ کے طور پر ہر اس چیز کے لئے استعمال کیا گیا ہے جو محسوسات کو ظاہر کرتی ہے۔ اس کے بعد اس کے معنی کو غیر محسوس پر بھی اطلاق کیا گیا ہے۔ اس لئے عقل کو بھی ایک نور کہا گیا ہے جو معقولات کو ظاہر کرتی ہے، اور یہ سب استعمال نور کے معنی کا تجزیہ کرنے سے ہاتھ آتے ہیں جو عبارت ہیں الظاہر بذاتہ المظہر لغیرہ سے [4]

اس لئے، لفظ نور سے سمجھ میں آتا ہے کہ، وہ محسوس نور ہے جو اجسام نوری سے پھیلتا ہے، جیسے: سورج، ستارے، چراغ اور انسان کے بنائے گئے لیمپ۔ اگر یہ نور نہ ہوتا تو دنیا تاریک ہوتی لیکن ان کے وجود سے فضا نورانی اور روشن ہے۔

لیکن فزیکس کے سائنسدانوں کی نظر میں نور کی حقیقت اور عمیق تعریف کچھ اور ہے اور شاید ان کی نظر میں نور کی حقیقت مکمل طور پر انکشاف نہ ہوئی ہو یا نور کی حقیقت کے بارے میں اختلاف رکھتے ہوں۔ جو کچھ مسلم ہے، وہ یہ ہے کہ مادی دنیا میں نور کے نام سے ایک چیز موجود ہے جو ایسے اجزا سے بنی ہے جو نورانی ہیں اور اصطلاح میں انہیں منبع نورانی کہا جاتا ہے۔ لیکن لفظ نور کا اطلاق نور حسی تک محدود نہیں ہے، بلکہ ہر وہ چیز جو روشن اور روشن کرنے والی یا دوسرے الفاظ میں پیدا اور پیدا کرنے والی ہو اسے نور کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہم علم کے بارے میں کہتے ہیں: علم نور ہے کیونکہ اس کی ذات میں روشنی ہے اور بعض حقائق کو روشن کرتا ہے۔ [5]

چنانچہ قرآن مجید مومن کے بارے میں فرماتا ہے: کیا جو شخص مردہ تھا پھر ہم نے اسے زندہ کیا اور اس کے لئے ایک نور قرار دیا جس کے سہارے وہ لوگوں کے درمیان چلتا ہے...[6] پس قرآن مجید کی ثقافت میں ایمان نور ہے، اور چونکہ ایمان مومن کو قلب اور باطن کی نورانیت بخشتا ہے اور اسے اپنا مقصد اور ہدف دکھلاتا ہے اور سعادت کی طرف رہنمائی کرتا ہے، اس لئے اس پر نور کا اطلاق صحیح ہے چنانچہ عرفا عشق کو نور کہتے ہیں، مولانا روم

کہتے ہیں:

عشق قہار است و مومن مقہور عشق چون قمر روشن شدم از نور عشق[7]

لفظ نور کا خدا پر اطلاق:

خداوند متعال پر لفظ نور کا اطلاق بھی صحیح ہے، کیونکہ اس قسم کا اطلاق قرآن مجید اور روایتوں میں آیا ہے۔ [8] لیکن اس بات کو مد نظر رکھنا چاہئے، کہ جب ہم کہتے ہیں کہ خدا نور ہے تو ہماری مراد حسی اور مادی نور نہیں ہوتی ہے، بلکہ اس معنی میں ہے کہ خدا کی ذات، پیدا اور پیدا کرنے والی ذات ہے، روشن اور روشن کرنے والی ذات ہے، ہر چیز کا پیدا ہونا اور اس کی روشنی اس کی ذات کی روشنی ہے لیکن وہ خود پیدا اور روشن ہے، کسی چیز نے اسے پیدا اور روشن نہیں کیا ہے، اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ خدا نور ہے۔

علامہ طباطبائی فرماتے ہیں: چونکہ ہر چیز کا وجود وہستی اس چیز کے ظہور کا سبب دوسروں کے لئے ہے، پس نور کا مکمل مصداق، وہی وجود ہے اور دوسری جانب چونکہ ممکن مخلوقات کا وجود حق تعالیٰ کی ایجاد پر مبنی ہے، اس لئے خداوند متعال نور کا مکمل ترین مصداق ہے۔ وہ ظاہر بالذات اور اپنے علاوہ سب چیزوں کو ظاہر کرنے والا ہے،اور ہر مخلوق اس کے وسیلہ سے ظاہر ہوتی ہے اور وجود میں آتی ہے۔ اس لئے خدائے سبحان نور ہے جس کے وسیلہ سے آسمان اور زمین ظہور پا چکے ہیں اور آیہ شریفہ اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط [9] سے مراد بھی یہی ہے۔

مذکورہ مطالب کے پیش نظر اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط کے معنی واضح ہوئے کہ اگر ہم یہ کہیں گے کہ خدا آسمانوں اور زمین کا نور ہے تو یہ اس معنی میں ہے کہ خدا آسمانوں اور زمین کو ظاہر کرنے والا، روشن کرنے والا اور پیدا کرنے والا ہے اور آسمانوں اور زمین کی تعبیر پوری عالم ہستی ہے اور کائنات میں موجود تمام مخلوقات ہے۔ [10] اس سے مراد صرف

ہمارے سر پر موجود آسمان اور ہمارے پاؤں تلے زمین نہیں ہے ۔ اس لئے اس آیہ شریفہ کے معنی یہ ہیں: خداوند متعال تمام کائنات کا نور ہے۔اور نور کی تعبیر پیدا کرنے والا نہی ہے، بلکہ اس مطلب کی طرف متوجہ کرنے کے لئے ہے کہ جس طرح نور خود ظاہر ہے اور اس کے لئے ظاہر کرنے والے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے، کیونکہ وہ مظہر اور تمام اشیاء کو روشنی بخشنے والا ہے ۔ خداوند متعال بھی ظاہر کرنے والے اور پیدا کرنے والے کا محتاج نہیں ہے، وہ ایک ظاہر، واضح اور بدیہی موجود ہے اور اس کے وجود کے استدلال کے لئے کسی واسطہ کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ وہ کائنات کی تمام مخلوقات کا خالق اور پیدا کرنے والا ہے ۔ حاجی سبزواری کی تعبیر میں: **یامن ھو اختفی لفرط نورہ**[11] یعنی اے وہ کہ جو اپنے نور کی فرط شدت کے سبب مخفی ہوا ہے۔

پس چونکہ اہل عرفان نے (انبیاء وائمہ اطہارؑ کی اطاعت کے مطابق) بیان کیا ہے کہ خداوند متعال خود تمام معانی میں جلوہ گر اور کامل روشن ہے، اس کا استخراجی استدلال کیا جانا چاہئے نہ کہ انی استدلال۔[12] پہلے خدا کی معرفت پیدا کی جانی چاہئے تا کہ اس کی معرفت سے اس کی مخلوقات کی معرفت پیدا کی جائے، نہ یہ کہ پہلے مخلوقات کی پہچان حاصل کی جائے پھر خدا کی معرفت حاصل کرنے کی کوشش کی جائے اور خدا کو اس کی مخلوق کے نور کی روشنی میں پہچانا جائے۔

چنانچہ دعائے عرفہ امام حسین علیہ السلام میں آیا ہے: **الٰھی ترددی فی الاٰثار یوجب بعد المزار** خداوندا ! تیرے آثار و مخلوقات کی طرف میری توجہ میرے لئے تیرے دیدار اور تجھ سے دوری کا سبب بنتا ہے ۔ امیر المومنین علیہ السلام دعائے کمیل میں فرماتے ہیں: وبنور وجہک الذی اضاء لہ کل شیء[13] تیرے چہرہ کے نور کی قسم جس سے سب چیزیں روشن ہیں۔ اگر تیرے چہرہ کا نور اور تیری ذات نہ ہو تو سب چیزیں تاریک ہیں یعنی کوئی چیز نہیں

ہے اور تمام چیزیں تاریکی میں عدم ہیں ۔ اگر تیری ذات کا نور نہ ہوتو تمام اشیاء نیستی کی تاریکی میں چلی جائیں گی، نہ یہ کہ اشیاء شب کی تاریکی کے مانندکسی تاریکی میں ہیں ۔ پس کہنا چاہئے کہ: خدا وند متعال صرف نور ہے اور اس کے مقابل میں کوئی چیز نور نہیں ہے بلکہ اس کے مقابل میں تمام نور تاریکیاں ہیں چونکہ تنہا وجود جو اپنی ذات میں پیدا اور پیدا کرنے والا ہے، وہ صرف خدا ہے، دوسری تمام اشیاء اگر پیدا اور پیدا کرنے والی ہیں تو اپنی ذات میں تاریک ہیں اور خدا نے انہیں پیدا اور پیدا کرنے والا بنایا ہے۔[14]

اس لئے علامہ طباطبائی نے اس آیہ شریفہ کی ایک خوبصورت انداز میں یوں تفسیر کی ہے: پس استفادہ کیا جاسکتا ہے کہ خدا وند متعال کسی بھی مخلوق کے لئے مجہول نہیں ہے، کیونکہ تمام اشیاء کا ظہور اپنے لئے یا دوسروں کے لئے، خدا کی جانب سے ہے، اگر خدا کسی چیز کا اظہار نہیں کرتا اور مخلوق کو ہستی نہیں بخشتا، تو وہ مخلوق ظہور نہ پاتی۔ پس ہر چیز سے پہلے، ظاہر بالذات خدا ہے ... نتیجہ یہ کہ جملہ خدا آسمانوں اور زمین کا نور ہے کہ اس عام نور سے ایک عالم ترقی پاتا ہے، وہ نور جس کے وسیلہ سے ہر چیز روشن ہوتی ہے اور ہر چیز کے وجود سے مساوی ہے، اور یہ وہی خدا کی عام رحمت ہے۔[15]

لہٰذا قرآن مجید کی ثقافت کے مطابق، خدا وند متعال ایک غائب اور ایک مخفی بالذات نہیں ہے تا کہ اپنی مخلوق اور عالم خلقت، اور آسمان وزمین کے ذریعہ کشف اور ہویدا ہو جائے، بلکہ اس قسم کی معرفت، ناقص اور کمزور اور ابتدائی ہے۔ حقیقی معرفت یہ ہے کہ کائنات کو خدا سے پہچانا جائے، نہ کہ خدا کو کائنات سے ۔ اور یہ آیہ شریفہ فرماتی ہے کہ خداوندمتعال کمال میں واضح، روشن اور بدیہی ہے۔

نوریا نوراعظم:

اس آیہ شریفہ سے حاصل ہونے والا ایک اور نکتہ یہ ہے کہ: ہم خدا وند متعال

کو نور رکھتے ہیں، لیکن نور اعظم نہیں کہتے، یعنی ہم ایسے نور رکھتے ہیں جن میں سے کچھ بڑے اور کچھ چھوٹے ہیں اور خداوند متعال بڑا نور ہے۔ بلکہ قرآن مجید کی نظر میں ایک نور سے زیادہ کوئی نور نہیں ہے اور وہ خدا ہے اور باقی تاریکی اور نابودی ہیں۔ ہاں، چیزوں کے آپسی موازنہ میں ایک چیز نور ہوتی ہے اور دوسری نور نہیں ہوتی۔ مثلاً علم و ایمان و عقل وغیرہ نور ہیں، لیکن انہوں نے اپنی نورانیت خداوند متعال سے حاصل کی ہے۔ لہٰذا خدا کے مقابل میں وہ نور نہیں ہیں یا دوسری تعبیر میں، خداوند متعال نور النور ہے۔[16] یعنی تمام نوروں کا نور ہے نہ یہ کہ نور اعظم ہے۔ پس یہ عقیدہ جو مانویہ سے منسوب ہے کہ وہ خداوند متعال کو نور اعظم جانتے ہیں، یعنی ایک حسی نور کے عنوان سے لیکن ایک بڑا نور جانتے تھے، بہر حال جو بھی شخص یہ عقیدہ رکھتا ہو، یہ ایک باطل عقیدہ ہے۔[17]

آخر پر ہم حضرت امام رضا علیہ السلام کی ایک روایت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ آپؑ نے، آیہ شریفہ اللہ نور السموات والارض کے بارے میں عباس بن ہلال کی طرف سے پوچھے گئے ایک سوال کے جواب میں فرمایا: وہ اہل آسمان کے لئے ہادی ہے اور اہل زمین کے لئے ہادی ہے۔[18]

منابع و ماخذ:

١۔ جوادی آملی، عبداللہ، تفسیر موضوعی قرآن کریم، ج١٢، فطرت در قرآن، ص٢٩٧۔٢٩١ و ج٣، وحسی و نبوت در قرآن، ص١٤٠۔١٣٨۔

٢۔ صدوق، توحید۔

٣۔ طباطبائی، محمد حسین، تفسیر المیز ان،، ج١٥، سورہ مبارکہ نور۔

٤۔ مخر رازی، تفسیر الکبیر، ٢٣، تفسیر آیہ اللہ نور السموات والارض۔

٥۔ مطہری، مرتضی، تفسیر سورہ نور۔

٦۔ مکارم شیرازی، ناصر، تفسیر نمونہ، ج ١٤، تفسیر سورہ نور۔

٧۔ ہاشم بحرانی، تفسیر برہان۔

حواشی

[1]۔ سوہ نور، ٣٥۔

[2]۔ ملاحظہ ہو: کشف المراد فی شرح تجرید الاعتقاد، ص ٢٨٧، مؤسسہ امام صادق علیہ السلام، علامہ طباطبائی، نہایہ الحکمہ، ص ٢٧٥۔

[3]۔ فخر رازی، التفسیر الکبیر، جزء ٢٢، ص ٢٢٤۔

[4]۔ طباطبائی، سید محمد حسین،، المیزان فی تفسیر القرآن، ترجمہ موسوی ہمدانی، ج ١٥، ص ١٧٢۔

[5]۔ مطہری، مرتضی، تفسیر سورہ نور،، ص ١٠١۔

[6]۔ سورہ انعام، ١٢٢۔

[7]۔ مولوی، مثنوی،، دفتر ششم۔

[8]۔ اسمائے الٰہی میں سے ایک نام نور ہے۔ قرآن مجید میں خداوند متعال پر نور کا اطلاق ہونے کے علاوہ بہت سی روایتوں میں بھی اس قسم کا اطلاق آیا ہے اور نور خدا کے ٩٩ ناموں میں سے ایک نام ہے۔ ملاحظہ ہو صدوق، توحید،، باب ٢٩، ص ١٩٤، حدیث ٨، وص ١٩٥، حدیث ٩ وص ٢١٩، حدیث ١١.....، خصال، ج ٢، باب ٨٠، ص ٥٩٣، حدیث ٤، بہت سی دعاؤں، جیسے دعائے جوشن کبیر اور دعائے کمیل وغیرہ میں خدا کے اس نام یعنی نور کا ذکر آیا ہے۔ اسلامی عارفوں نے بھی خدا کے ناموں کے بارے میں ذکر کیا ہے ان کی تفصیل بیان کرنا یہاں پر ممکن نہیں ہے۔

[9]۔ ترجمہ المیزان، ج ١٥، ص ١٧٢۔

[10]۔ مطہری، مرتضی، تفسیر سورہ نور، ص ٩٨۔

[11]۔ سبزواری، ملا ہادی منظومہ، بخش حکمت۔

[12]۔ مختلف استدلال کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے، منطق کتابوں، صناعات خمس اور صنعت برہان کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔

[13]۔ مفاتیح الجنان، دعای کمیل۔

[14]۔ ملاحظہ ہو: شہید مطہری، مرتضی، تفسیر سورہ نور، ص۱۰۲۔

[15]۔ ترجمہ تفسیر المیز ان، ج۱۵، ص۱۷۳۔

[16]۔ مفاتیح الجنان میں نور کے نام سے ایک دعا ہے: یا نور یا نور النور اس کے علاوہ دعائے جوشن کبیر میں بھی اس طرح کی تعبیر آئی ہے۔

[17]۔ ملاحظہ ہو: شہید مطہری، مرتضی، تفسیر سورہ نور، ص۱۰٤، و پاورقی، ص۹۹۔

[18]۔ ملاحظہ ہو: صدوق، توحید، باب پانزدہم، حدیث اول، بحرانی، سید ہاشم، تفسیر برہان، ج۳، ذیل آیہ شریفہ۔

شیطان، ہماری فکر و اندیشہ میں کیسے نفوذ کر کے اپنے عزائم کو القا کرتا ہے؟

مختصر جواب

اس سے قبل کہ ہم انسان کے اندر شیطان کے نفوذ کی راہوں پر بحث کریں، ضروری ہے کہ شیطان نامی مخلوق کے بارے میں ایک اجمالی شناخت پر روشنی ڈالیں۔ لفظ شیطان کی اصل کے استنباط کے بارے میں صاحبان نظر کے درمیان اختلافات پائے جاتے ہیں،لیکن ان میں سے صحیح تر یہ ہے کہ یہ لفظ مادہ شطن یعنی دور کیا ہوا سے لیا گیا ہے۔لہٰذا اس کے مختلف مصادیق ہو سکتے ہیں،لیکن ان میں واضح ترین مصداق اور ان سب کا رئیس ابلیس ہے۔

شیطان، جنات میں سے ایک مخلوق ہے، اس لئے وہ مختلف شکلوں میں، ہر چیز کے قالب میں، یعنی حیوانوں اور غیر معصومیں، انسانوں کی صورت میں ظاہر ہوسکتا ہے

لہٰذا انسان کو بہکانے کے سلسلہ میں اس کی بنیادی راہوں میں سے ایک یہی راہ ہے، کہ انسانوں کے نازک اور فیصلہ کن لمحات میں خود کو بظاہر نیک انسان کی صورت میں پیش کرتا ہے اور انسان کو اپنی طرف جذب کرنے کے اسباب فراہم کرتا ہے۔

لیکن وہ ہمیشہ اس روش سے استفادہ نہیں کرتا ہے۔ وہ ایک مثالی مخلوق ہے، یعنی

تجرد اور تجسم کی درمیانی حالت رکھتا ہے، اس لحاظ سے انسان کے مجرد روح، یعنی وجود اور انسانیت، میں براہ راست داخل نہیں ہوسکتا ہے،اس لئے نفس امارہ کی راہ سے اپنے عزائم کو ہماری روح و جان میں ڈالتا ہے۔ نفس امارہ انسان کا وہی حیوانی پہلو ہے جو کہ ترقی و کمال کی صورت میں نفس مطمئنہ یا روح عالی میں تبدیل ہوتا ہے۔

لہٰذا شیطان، انسان کے نفس امارہ یا نفسانی خواہشات کے رجحانات کے مطابق دعوت اور جلوہ نمائی کر کے انسان کو گمراہ اور فریب دینے کے اسباب فراہم کرتا ہے۔ اس لئے شیطان، انسان کو بہکانے اور فریب دینے کے اسباب وعوامل کا ایک جزو ہے نہ کہ علت تامہ۔

لیکن اس کی اس جلوہ نمائی کے مختلف مظاہر ہیں کہ جو سب کے سب ہمارے حیوانی رجحانات سے ہم آہنگ ہیں، اور یہ حسب ذیل ہیں:

الف) برے اعمال کو خوبصورت انداز میں پیش کرنا: شیطان، برائیوں کو خوبصورت دکھلا کر ظلم و گناہ کی برائی کو ختم کر دیتا ہے اور محرمات کو انجام دینے کے اجتماعی موانع کو کم کرتا ہے تا کہ انسان آسانی کے ساتھ گناہ کے پھندے میں پھنس جائے۔ یہ وہی استدلال اور توجیہات ہیں جنہیں ہم گناہ کے مرتکب ہونے میں اپنی جگہ پر پیش کرتے ہیں۔

ب) جھوٹے وعدے: شیطان جھوٹے کر کے اور نا قابل عمل بڑی بڑی بالا آرزوں کو پیش کر کے، انسان کو معاد، موت اور خداوند متعال کی یاد سے غافل کر دیتا ہے اور اس قسم کا انسان نفسانی خواہشات سے دو چار ہوتا ہے اور ان نام نہاد آرزوں کو پورا کرنے کے لئے، بڑے سے بڑے گناہ انجام دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

ج) خوف و ہراس: شیطان، انسان میں مستقبل اور اس کے حوادث کے بارے میں خوف ووحشت پیدا کر کے اسے دولت جمع کرنے، جہاد سے فرار کرنے اور طاغوت سے تعاون کرنے کی ترغیب دیتا ہے اور اسے مستقبل کے خوف سے پیدا ہوئے برے اعمال اور

گناہوں کو انجام دینے پر مجبور کرتا ہے۔

تفصیلی جواب

مذکورہ سوال کے صحیح جواب تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ہم شیطان نامی اس مخلوق کے بارے میں ایک اجمالی تعارف حاصل کریں۔ لفظ شیطان کی اصل کے استنباط کے بارے میں دانشوروں میں اختلاف نظر پایا جاتا ہے۔لیکن ان میں سے سب سے مناسب تر یہ ہے کہ لفظ سیطان مادہ شطن سے لیا گیا ہے اور اس کے معنی دور کیا ہوا ہیں۔[1]

بہت سے مفسرین کے کہنے کے مطابق، شیطان، ایک ایسی مخلوق ہے، جو موذی اور باغی ہے اور سیدھے راستہ بھٹک کر گمراہ ہوگیا ہے۔ اس فرض کی بنا پر، شیطان کا نام ایک عام نام ہے، جس کے متعدد مصادیق ہیں اور ان مصادیق میں جن وانس میں سے ہر باغی مخلوق شامل ہوتی ہے۔[2] لیکن ابلیس وہی شیطان ہے جس نے ابوالبشر حضرت آدمؑ[3] کے لئے سجدہ کرنے سے انکار کیا۔

قرآن مجید کی وضاحت اور صراحت کے مطابق، ابلیس جنس جن میں سے ہے[4] اور آگ سے پیدا کیا گیا ہے اس قسم کی مخلوقات کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جسم وتجرد کی ایک درمیانی حالت رکھتے ہیں، اس لئے شیاطین مختلف شکلوں میں رونما ہوسکتے ہیں یعنی ایک ظاہری قالب اور عینی حالت میں رونما ہوسکتے ہیں۔

بظاہر، سوال سے مراد، وہی ابلیس ہے۔ اسی مفروضہ کی بنا پر ہم جواب دینے کی کوشش کریں گے۔ جیسا کہ ہم نے کہا کہ شیطان ایک مثالی مخلوق ہے اور ہم جانتے ہیں کہ انسان ایک دو زاویوں سے مخلوق ہے، یعنی انسانی پہلو بھی رکھتا ہے اور روحانی پہلو بھی رکھتا ہے۔ پس اگر شیطان انسان کو فریب دینا چاہے تو وہ مجبور ہے کہ انسان کی روح سے رابطہ

کرے اور انسان کی روح حقیقت میں انسان کا وجود اور انسانیت ہے۔ انسان کا نفس مختلف پہلوؤں کا مالک ہے۔ روحانی پہلو، جسے روح یا نفس مطمئنہ کہا جاتا ہے اور اس کے شیطانی پہلو کو نفس امارہ یا نفسانی خواہشات کہتے ہیں۔

شیطان، انسان پر حکمرانی کرنے کے لئے، مجبور ہے کہ اس کے نفس امارہ[5] سے استفادہ کرے اور دوسری جانب وہ ایک مثالی مخلوق ہے اور مثالی مخلوق ایک جسمانی مخلوق سے براہ راست رابطہ نہیں رکھ کرسکتی ہے۔ لہٰذا شیطان کا انسان کے نفس امارہ سے رمز یہ رابطہ وہی چیز ہے جسے القا یا وسوسہ کے عنوان سے یاد کیا جاتا ہے۔

علامہ طباطبائیؒ، اس سلسلہ میں کہتے ہیں: شیطان دل میں وسوسہ ڈالنے کے طریقے سے انسان کو بہکاتا ہے۔[6]

پس شیطان علت کا ایک جزو ہے اور اکیلے ہی انسان کو گمراہ نہیں کرسکتا ہے، بلکہ انسان کو اس کی نفسانی خواہشات کے مطابق دعوت دیتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں شیطان علت کا ایک حصہ ہے نہ کہ مکمل علت۔

انسان بھی اس کی نسبت، مختار ہے اور اس کے نقش قدم پر چل سکتا ہے یا حق اور اپنی عقل کی پیروی کرسکتا ہے۔ اسی لئے خداوند متعال انسان کو شیطان کے فرمان پر عمل کر نے سے منع کرتے ہوئے فرماتا ہے: شیطان کے نقش قدم پر نہ چلنا، کیونکہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔[7]

اب سوال یہ ہے کہ شیطان، انسان کے غیر معقول جذبات اور نفسانی خواہشات کو کیسے مشتعل کرتا ہے اور اسے برے اعمال انجام دینے پر مجبور کرتا ہے؟ شیطان اپنے اس مقصد تک پہنچنے کے لئے مختلف طریقوں سے استفادہ کرتا ہے کہ ہم یہاں پر ان میں سے چند مواقع کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

جیسا کہ ہم نے کہا کہ شیطان ایک عینی مخلوق کے عنوان سے ظاہری صورت اختیار کرسکتا ہے۔ یہ شیطان کے بہکانے کا ایک طریقہ ہے، یعنی نازک اور تاریخی لمحات میں، ایک نیک انسان کے عنوان سے ظاہر ہوکر انسانوں کو حق کی راہ سے، گمراہ کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں کچھ نمونے تاریخ میں درج ہو چکے ہیں، اور ممکن ہے ایسا واقعہ ہم میں سے بھی ہر کسی کسی کی لئے پیش آیا ہو۔[8]

لیکن وہ دوسری روشوں سے بھی استفادہ کرتا ہے، جن کے بارے میں قرآن مجید کی آیات میں اشارہ ہوا ہے:

الف) برے اعمال کو خوبصورت انداز میں پیش کرنا: یعنی شیطان ناپسند اور برے کاموں کو خوبصورت انداز میں پیش کرتا ہے، تا کہ انسان کو ان پر عمل کرنا پسندیدہ اور شائستہ نظر آئے۔ یہ وہی چیز ہے کہ قرآن مجید میں اسے باطل کو حق کا لباس پہنانے[9] اور حق کو باطل کا لباس پہنانے کی تعبیر کی گئی ہے اور یہ یہودیوں کی ایک روش ہے۔

اعمال کو زینت بخشنا، ایک آسان راہ ہے اور انسان کے نفسانی خواہشات کے موافق ہے۔ اس لئے قرآن مجید میں آیا ہے: شیطان نے ان کے کردار کو زینت بخشی، پھر انہیں خدا کی راہ سے گمراہ کیا...[10]

ب) جھوٹے وعدے: شیطان، جھوٹے وعدے اور بلند و بالا آرزؤں کو ترویج دے کر اور حقائق اور اس کے سامنے موجود چیلنجوں سے انسان کو غافل کر کے نا قابل وصول وہم و گمانوں میں مشغول کرتا ہے ۔ اور یہ تو معلوم ہے کہ اس قسم کی چیز کا نتیجہ خداوند متعال سے غفلت اور دین فراموشی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

اس لئے خداوند متعال فرماتا ہے: شیطان ان سے وعدہ کرتا ہے اور انہیں امیدیں دلاتا ہے...[11]

ج) خوف وہراس: شیطان کے حربوں میں سے ایک حربہ، انسان کو اس کے مستقبل کے بارے میں ڈرانا اور دھمکانا ہے۔خوف و ہراس کی یہ حالت ایک علت ہے مختلف اور فراوان ناپسند عوامل کے لئے، جیسے: امید، خدا کے بارے میں غلط فہمی، عدم توکل اور بالآخر انسان کو نیک کام انجام دینے سے روکنا، مثال کے طور پر شیطان انسان کو مستقبل کے فقر وتنگدستی سے ڈراتا ہے اور یہ امر انسان کے لئے۔بخل سے کام لینے اور خیرات نہ کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔ یہ موضوع بھی قرآن مجید کی آیات میں مرکز توجہ قرار پایا ہے، خدائے متعال فرماتا ہے: شیطان تم سے فقیری کا وعدہ کرتا ہے اور تمہیں برائیوں کا حکم دیتا ہے۔[12]

منابع وماخذ:

۱۔تفسیر نمونہ، ناصر مکارم شیرازی۔

۲۔المیزان، محمد حسین طباطبائی۔

۳۔اخلاق درقرآن، محمد تقی مصباح یزدی۔

حواشی

[1] لسان العرب، ج ۱۳ اصطلاح شطن۔ [2] تفسیر نمونہ، ج۱،ص ۱۹۱

[3] جب ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کے لئے سجدہ کروتو ابلیس کے علاوہ سب نے سجدہ کرلیا۔اس نے انکار اور غرور سے کام لیا اور کافرین میں ہوگیا بقرہ۔۳٤۔

[4] سورہ کہف، آیہ ۵۰۔ [5] اخلاق درقرآن،ص ۲۳٤۔

[6] ترجمہ المیزان، ج۱،ص ۲۰۱۔ [7] سورہ بقرہ، آیہ ۲۰۸۔

[8] ملاحظہ ہو: سلیم ابن قیس ہلالی، اسرار آل محمد،ص ۲۲۰۔

[9] سورہ بقرہ، ٤۲۔ [10] سورہ نحل، ۲٤۔

[11] سورہ نساء، ۱۲۰۔ [12] سورہ بقرہ، ۲٦۸۔

سورہ شوریٰ کی آیت نمبر ۲۳ میں لفظ القربیٰ سے کیوں اہل بیتؑ کا مراد استنباط کرتے ہیں؟

مختصر جواب

ہر کلام اور جملہ میں اگر بولنے والے کی مراد، اس جملہ یا اس میں استعمال ہوئے الفاظ سے معلوم نہ ہوتو، ان قرینوں کی تلاش کرنی چاہئے جو اس کلام سے بولنے والے کی مراد واضح کریں اور سورہ شوری کی آیت نمبر ۲۳ قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ط کے سلسلہ میں چند قرائن اور علامتیں موجود ہیں جو ہمیں لفظ القربی سے خداوند متعال کی حقیقی مراد کو حاصل کرنے میں مدد کرتی ہیں:

۱) اہل لغت کے مطابق لفظ القربی کی معنی نسبی رشتہ دار اور اقرباء ہیں اور قرآن مجید میں بھی موضوع سوال آیت کے علاوہ یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے آیہ مودت کے علاوہ دوسری آیات میں اس لفظ کے ساتھ، ذی یا ذوی اور یا اولی کے الفاظ اضافہ کئے گئے ہیں اس اضافہ کے باوجود اس کا مفہوم ذوی القربی یعنی رشتہ دار ہے اور اسی لئے محققین نے زیر بحث آیت میں لفظ اہل اور یا ذوی و...کو زیر نظر رکھا ہے۔

لہٰذا ہم اس تفسیر کو قبول نہیں کر سکتے ہیں، جس میں القربی کے معنی قرب الٰہی یا دوسرے کوئی معنی بتائے گئے ہوں

۲) بعض قرائن اس امر کے شاہد ہیں کہ آیت میں رشتہ داروں سے مراد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رشتہ دار ہیں اور آیت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہر مسلمان پر لازم ہے کہ اجر رسالت کے عنوان سے اپنے رشتہ داروں سے محبت کرے

۳) فعل لا اسئلکم کا ذکر اس بات کی علامت ہے کہ القربی سے مراد سائل کے اقرباء ہیں اور یہ منسوب الیہ کو معین کرنے کے طریقہ سے صاحب قرابت کا تعین ہے، اس کے مانند سورہ توبہ کی آیت ۱۱۳ اور سورہ حشر کی آیت نمبر ۷ ہے

٤) اجر رسالت کے سلسلہ میں نازل ہوئی آیات پر غور کرنے سے، ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ القربی سے مراد اہل بیت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، کیونکہ قرآن مجید نے ایک طرف اجر رسالت کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دوسرے انبیاء سے طلب کرنے کی نفی کی ہے اور دوسری طرف پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں فرمایا ہے: میں آپ سے کوئی اجر نہیں چاہتا ہوں مگر میرے رشتہ داروں کی دوستی اور تیسری جانب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کو قبول کرنا اور خدا کی راہ کو انتخاب کرنا اجر رسالت کے عنوان سے بیان ہوا ہے اور چوتھی جانب خداوند متعال نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے چاہا ہے کہ لوگوں کو پہنچا دے کہ: جو اجر میں نے تم سے چاہا ہے صرف تمہارے فائدہ میں ہے، میرا اجر خداوند متعال پر ہے ان آیات کو آپس میں ربط دینے سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ: ذوالقربی، خدا کی راہ ہے اور اس راہ الہی کی پیروی کرنا لوگوں کے فائدہ میں ہے اور ان کی اطاعت کرنا، دعوت الہی کو قبول کرنے کا واضح مصداق ہے

سرانجام قابل اعتبار روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ: اس قسم کے امتیاز کے حامل صرف پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت ہیں

تفصیلی جواب

ہر لفظ اور جملہ میں اگر کلام کے بولنے والے کہ مراد معلوم نہ ہو سکے تو ہمیں قرائن

اور ایسے مسائل کی تلاش کرنی چاہئے جو اس کے مراد و مقصود کو ہمارے لئے واضح کریں زیر سوال[1] آیت میں، بعض قرائن[2] پائے جاتے ہیں جو لفظ القربی میں خداوند متعال کی مراد تک پہنچنے میں ہماری راہنمائی کرتے ہیں:

۱) اہل لغت کے مطابق لفظ القربی نسبی قرابتداری کے معنی میں ہے[3] اور قرآن مجید میں بھی ایسے افراد کے بارے میں استعمال ہوا ہے کہ جو صاحب اقربا ہیں خاص کر جو رشتہ دار رکھتے ہیں، اس لئے کبھی لفظ ذی اس پر اضافہ کیا گیا ہے[4] اور کبھی ذوی[5] اور بعض اوقات لفظ اولی[6] اس پر اضافہ کیا گیا ہے صرف ایک جگہ ہے جہاں پر یہ لفظ کسی اضافہ کے بغیر استعمال ہوا ہے اور یہ وہی آیت ہے جس کے بارے میں سوال کیا گیا ہے ... **اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى** ط. اس لئے ضروری ہے کہ القربی سے پہلے اہل،[7] یا ذوی جیسے کسی لفظ کو زیر نظر رکھا جائے اور اس طرح المودہ فی القربی کے معنی ہوں گے (پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے) اقرباء اور رشتہ داروں کی محبت، جو وہی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت وعترت ہیں

اس لئے، جنہوں نے اس آیت میں القربی سے قرب الٰہی کی[8] تفسیر کی ہے، وہ صحیح نہیں ہیں[9] کیونکہ اس تفسیر کی بنا پر لفظ قربی کے معنی نزدیک کرنے والا ہوگا کہ نہ اقربا و رشتہ دار، اور یہ اس چیز کے خلاف ہے جسے ارباب لغت نے بیان کیا ہے

اس کے علاوہ، اس قسم کے معنی آیت میں ابہام پیدا ہونے کا سبب بن گئے ہیں، نتیجہ کے طور پر مشرکین آیت کے مخاطب نہیں ہو سکتے ہیں، کیونکہ وہ تقرب الٰہی کے منکر نہیں تھے، بلکہ، تقرب الٰہی حاصل کرنے کے لئے بتوں اور خداؤں کی پرستش کرتے تھے[10]

ممکن ہے، یہ کہا جائے کہ القربی مصدر ہے اور یہ مصدر اقربا اور رشتہ داری کے معنی میں ہے نہ رشتہ کے معنی میں اور فی بھی سببیت کے معنی میں ہے اور اس نظریہ کے مطابق آیت کے مفہوم میں تین احتمال پائے جاتے ہیں: الف) آیت قریش سے مخاطب ہے اور ان سے

چاہتی ہے: اگر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان نہ لاؤ گے تو کم از کم رشتہ داری کے لحاظ سے انہیں دوست رکھو اور انہیں تکلیف نہ پہنچاؤ ب) آیت انصار سے مخاطب ہے اور ان سے کہا گیا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رشتہ داری کی وجہ سے، ان سے محبت کریں...[11] ج) آیت کے مخاطب قریش ہیں اور المودہ فی القربی سے مراد پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت ہے نہ کہ قریش کی، یعنی میں تم قریش سے اجر نہیں چاہتا ہوں لیکن تماری نسبت میری محبت تماری میرے ساتھ رشتہ داری کی وجہ سے ہے اور یہ چیز مجھے اجازت نہیں دیتی ہے کہ تماری نسبت لا پروائی سے کام لوں، بہر حال رشتہ داری مجھے مجبور کرتی ہے کہ تماری ہدایت کروں نہ تم لوگوں سے اجرت لینے کے لئے

اگر چہ یہ تین احتمال ممکن ہے ابتدا میں معقول اور دلکش دکھائی دیں، لیکن تھوڑا سا غور کرنے کے بعد واضح ہوتا ہے کہ ان میں سے کوئی ایک بھی صحیح نہیں ہے، کیونکہ اگر آیت سے مراد کفار قریش ہوں تو، انہوں نے تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی بھی چیز قبول نہیں کی ہے جس کی اجرت ادا کرنا ضروری ہو اور اگر مقصود قریش میں سے بعض افراد ہوں جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لائے ہیں ہے تو اس صورت میں کوئی بغض تصور نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ان سے مطالبہ کیا جائے کہ رسالت کی اجرت کے بدلے میں اس بغض سے دست بردار ہو جائیں، پس پہلا احتمال رد ہو گا اور اسی طرح پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت انصار کی دوستی اس قدر واضح تھی کہ کسی سے مخفی نہیں تھی اس لئے یہ بے معنی ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس قرابت کی دوری کی وجہ سے ان سے محبت کا مطالبہ کریں اس کے علاوہ عرب، ماں کی طرف سے رشتہ داری کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے تھے، [12] اور یہ اسلام ہے جو اس قسم کی قرابت کو اہمیت دیتا ہے۔ اس لئے دوسرا احتمال بھی معقول نہیں ہے لیکن تیسرے احتمال کی تنقید کے بارے میں کہا جا سکتا ہے: کیا اس قسم کا احتمال پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان اور قرآن مجید کی آیات کے منافی نہیں ہے؟ کیا قرآن مجید نے بارہا نہیں فرمایا ہے کہ آپ کا فریضہ صرف دعوت ہے اور ہدایت خدا

کے ہاتھ میں ہے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کفار کے لئے غمگین نہیں ہونا چاہئے، یہ کیسے باور کیا جاسکتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رشتہ داری کی وجہ سے بعض لوگوں کو ہدایت کریں اور بعض لوگوں کے ساتھ بغض کی وجہ سے ان کی ہدایت نہ کریں [13]

۲) اب جبکہ آیت میں موجود القربی سے کیا مراد ہے، یہ معلوم ہوگیا تو، یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ، نسب میں اقرباء اور رشتہ دار کون ہیں؟ جواب یہ ہے کہ اس آیت میں اصلی مقصود اہل بیت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں کیونکہ:

اولا، منسوب الیہ کا معین ہونا، صاحب قرابت کے معین ہونے کے لئے خود قرینہ ہے کبھی کلام میں منسوب الیہ ذکر ہوتا ہے اور یہ خود اس امر کی علامت ہوسکتی ہے کہ اقرباء سے مراد کون لوگ ہیں، مثال کے طور پر قرآن مجید کی اس آیت: ۱۱۲ مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أُولِي قُرْبَىٰ [14] میں، نبی اور الذین آمنوا کا ذکر اس نکتہ کے گواہ ہیں کہ اولی قربی سے مراد ہر انسان کے رشتہ دار ہیں اور یا آیہ: مَا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ مِنْ أَهْلِ الْقُرَىٰ فَلِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ [15] میں، علی رسولہ اس امر کا قرینہ ہے کہ لذی قربی سے مراد، رسول اللہ کے رشتہ دار ہیں اور آیہ شریفہ: قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا ... میں بھی فعل لا اسئلکم کا مقدم قرار پانا اس بات کی علامت ہے کہ القربی سے مراد سائل کے رشتہ دار ہیں [16] پس خود آیت میں قرینہ موجود ہے جو اس امر کی گواہی دیتا ہے کہ القربی سے مراد اہل بیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عزیز و اقارب ہیں اس لئے یہ احتمال نہیں دیا جاسکتا ہے کہ آیت میں رشتہ داروں کی محبت اجر رسالت کے عنوان سے بیان کی گئی ہے اور یہ آیت مسلمانوں سے مطالبہ کرتیہے کہ اپنے رشتہ داروں سے محبت کریں [17]

ثانیا، قرآن مجید میں اجر رسالت کے بارے میں جو آیتیں نازل ہوئی ہیں، وہ

مندرجہ ذیل مطالب پر مشتمل ہیں:

١ انبیاء کی طرف سے [18] اور اسی طرح پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم [19] کی طرف سے اجر و جزا کی نفی کرتی ہیں

٢ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں آیا ہے کہ: میں تم لوگوں سے کوئی اجرت نہیں مانگتا ہوں، مگر میرے اقربا سے محبت

٣ مزید بیان ہوا ہے کہ: میری اجرت وہ لوگ ہیں جنہوں نے میری دعوت کو اپنے اختیار سے قبول کیا ہے [20]

٤ ایک دوسری آیت میں آیا ہے کہ: جو اجرت لوگوں سے طلب کی گئی ہے وہ خود ان کے فائدے میں ہے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اجرت اور جزا صرف خدا کے پاس ہے [21]

مذکورہ آیات کو ایک دوسرے سے ملحق کرنے سے یہ نتیجہ حاصل کیا جاسکتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوسرے انبیاء کے مانند اپنے لئے کسی اجرت کا مطالبہ نہیں کیا ہے بلکہ اپنے عزیز و اقارب (عترت واہل بیت) کی محبت کا مطالبہ کیا ہے اور یہ خدا کی جانب ایک راہ ہے اور حقیقت میں خود لوگوں کے فائدہ میں ہے، کیونکہ یہ محبت امامت، خلافت اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانشینی اور لوگوں کی ہدایت کے مسئلہ کی طرف ایک دریچہ ہے اور یہ محبت دعوت قبول کرنے کا نتیجہ ہے [22]

ایک جہت سے اجر ایک ایسا لفظ ہے جو اجر دنیوی پر بھی لاگو ہوتا ہے اور اجر اخروی پر بھی اور جس چیز کی ان آیات میں نفی کی گئی ہے، وہ اجر دنیوی ہے، کیونکہ ان آیات میں آیا ہے کہ: میں تم لوگوں سے کسی اجرت کا مطالبہ نہیں کرتا ہوں، میں نے اجرت نہیں مانگی ہے، یہ اجر دنیوی کی دلیل ہے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی اس معنی کی گواہ ہے [23]، کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیوی اجر کے طالب نہیں تھے اور دوسری جانب سے: حقیقی اجر و جزا، اس وقت

متحقق ہوتا ہے جب اجر کا فائدہ اجر حاصل کرنے والے کو ملے، جبکہ ذوی القربی کی مودت و محبت، محب یعنی محبت کرنے والے کے فائدہ میں ہے نہ کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فائدے میں کیونکہ ذوی القربی کی محبت، محبت کرنے والے کے لئے اپنی زندگی میں ذوالقربی کی پیروی کرنے کا سبب بن جاتی ہے تا کہ انہیں اپنے لئے نمونہ عمل قرار دیں اور شیطان کے پھندے سے رہائی پائیں [24]

پس پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں سے اجر دنیوی کا مطالبہ نہیں کیا ہے اور ان سے اپنے اقرباء سے مودت و محبت کا مطالبہ کیا ہے، یہ حقیقی اجر نہیں ہے کیونکہ قرآن مجید نے فرمایا ہے کہ اس کا فائدہ خود لوگوں کو پہنچتا ہے

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کن لوگوں کی محبت اور پیروی کرنا لوگوں کے فائدے میں ہے؟ اور کن لوگوں کی مودت و محبت کرنا پیغمبر اسلام کی دعوت کو قبول کرنے کا مصداق ہے؟ اور کیا جہل و گمراہی کے بھنور میں پھنسے لوگوں کی محبت کرنا دوسروں کے لئے نجات کا سبب بن سکتا ہے؟ اور کیا اندھے کے عصا کو پکڑنے والا بھی اندھا ہو تو انسان کی منزل مقصود تک راہنمائی ممکن ہے؟

انسانوں کے لئے الٰہی ہدایت، رسالت کا اجر ہے اور یقینی طور پر یہ لوگوں کے فائدے میں ہے اور یہ امر بھی ایسے افراد کی ہدایت کی روشنی میں متحقق ہوتا ہے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نفس و جان، [25] چراغ ہدایت، [26] نجات کی کشتی، [27] باب علم [28] اور حق کی راہ [29] و...ہوں اور کیا یہ افراد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت کے علاوہ کوئی اور ہو سکتے ہیں؟

ثالثاً، اس سلسلہ میں شیعہ وسنی منابع سے نقل کی گئی بہت سی روایتیں، واضح طور پر قربی کی مراد بیان کرتی ہیں کہ ہم ان میں سے چند ایک کی طرف ذیل میں اشارہ کرتے ہیں:

۱ حاکم حسکانی اس آیت کے ذیل میں چند روایتیں نقل کرتا ہے جن سے معلوم ہوتا

ہے کہ ذوی القربیٰ سے مراد کون لوگ ہیں [30] جیسے: ابن عباس کہتے ہیں جب آیہ قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُکُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ط نازل ہوئی، تو اصحاب نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا، کہ خداوند متعال نے جن لوگوں کی محبت کرنے کا ہمیں حکم دیا ہے وہ کون ہیں: آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: علیؑ اور فاطمہؑ اور ان کے دونوں فرزند

۲ سیوطی نے اس آیت کے ذیل میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اس آیت سے مراد یہ ہے کہ میرے حق کو میرے اہل بیت میں محفوظ کریں [31]

۳ احمد بن حنبل نے فضائل الصحابہ میں اور قرطبی نے اس آیت کی تفسیر میں روایت نقل کہ ہے کہ اس سے علیؑ و فاطمہؑ اور ان کے دو بیٹے مراد ہیں [32]

٤ زمخشری [33] اور فخر رازی [34] نے بھی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے چند روایتوں سے استناد کر کے آیہ ذوی القربیٰ کو علیؑ و فاطمہؑ اور ان دونوں کے بیٹوں سے مخصوص جانا ہے

البتہ المودہ فی القربیٰ کی تفسیر کے بارے میں بعض اعتراضات کئے گئے ہیں، من جملہ اس کے کہ یہ قبول نہیں کیا جاسکتا ہے کہ المودہ فی القربیٰ سے مراد اہل بیت ہوں، کیونکہ مذکورہ آیت سورہ شوریٰ میں ہے اور یہ سورہ مکی ہے اور مکہ میں فاطمہ زہراءؑ اور حسنینؑ نہیں تھے کہ ان کی مودت رسالت کا اجر قرار پاتی!

اس کا جواب یہ ہے کہ: اولا، بہت سے مفسرین نے کہا ہے کہ سورہ شوریٰ کی یہ چار آیتیں مدنی ہیں نہ کہ مکی ثانیا بہت سی ایسی روایتیں موجود ہیں جو ان آیات کے نزول کو مدینہ بتاتی ہیں ثالثا، ممکن ہے ان آیات کا مکی ہونا، قبل از ہجرت نہ ہو، یعنی ہجرت کے بعد مکہ میں نازل ہوئی ہوں، یعنی حجہ الوداع میں فاطمہؑ و حسنؑ و حسینؑ کی ولادت کے بعد نازل ہوئی ہوں [35]

دوسرے اعتراضات پر غور کر کے ان کے جواب دینے کی یہاں پر گنجائش نہیں ہے بلکہ اس کے لئے مزید فرصت کی ضرورت ہے ہم یہاں پر خلاصہ کے پیش نظر اسی مقدار پر اکتفا کرتے ہیں اور جو قارئین اس سلسلہ میں مزید تحقیق و مطالعہ کے خواہشمند ہوں وہ درج ذیل منابع کی طرف رجوع کر سکتے ہیں:

١۔ احیاء المیت بفضائل اہل البیت، سیوطی، ص ٨

٢ الصواعق المحرقہ، ابن حجر، ص ١٠١

٣ المیزان، علامہ طباطبائی، ج ١٨، ص ٥١٥٣

٤ اہل البیت مقامہم، منہجہم، مسارہم، ص ١٤١٩

٥ پیام قرآن، مکارم شیرازی، ج ٩، ص ٢٢٥٢٣٧

٦ تفسیر قرطبی، ج ٨، ص ٥٨٤٣، ج ١٦، ص ٢١٢٢

٧ تفسیر نمونہ، ج ٧، ص ١٧٤ و ج ١١، ص ٣٦٩ و ج ١٢، ص ٩٥

٨ جامع البیان، طبری، ج ٢٥، ص ١٦

٩ حاکم، مستدرک الصحیحین، ج ٣، ص ١٧٣

١٠ حلیہ الاولیاء، حافظ ابونعیم اصفہانی، ج ٣، ص ٢٠١

١١ ذخایر العقبی، محب الدین طبری، ص ١٣٨

١٢ روح المعانی، ج ٢٥، ص ٣٢

١٣ کنز العمال، ج ١، ص ١١٨

١٤ مجمع البیان، ج ٩، ص ٢٨ و ٢٩ و ٥٠، ج ٧ و ٨ آغاز سورہ مؤمن، ص ٥١٢

١٥ مجمع الزوائد، ج ٩، ص ١٦٨

حواشی

[1] قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ط (شوری۔ ۲۳)

[2] قرائن دو قسم کے ہیں: وہ قرائن جو خود کلام یا جملہ میں موجود ہوں اور یا خارج میں موجود ہوں لیکن کلام ان سے متعلق ہے، کہ اس قسم کے قرائن کو قرینہ متصلہ کہتے ہیں، اور جو قرائن کلام میں موجود نہ ہوں اور بولنے والا انہیں کہیں اور سے حاصل کرتا ہو تو ایسے قرائن کو قرینہ منفصلہ کہتے ہیں

[3] مقاییس اللغہ نے کہا ہے: فلان ذوقربی ہومن یقرب منک رحما وہ اس کے ضمن میں کہتا ہے: القربی و القرابۃ بہ کے ایک ہی معنی ہیں لسان العرب اس سلسلہ میں بیان کرتا ہے: قرابت وقربی نسبی رشتہ کے معنی میں ہیں اور دوسرا کہتا ہے: و(القربی) فی الرحم و(القربہ) فی المنزله والاصل واحد (اقرب الموارد، ج۲، ص۹۷۸)

[4]، بقرہ۔ ۸۳۔ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى

[5] وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى ، بقرہ۔ ۱۷۷۔

[6] مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى ، توبہ۔ ۱۱۳

[7] اس سلسلہ میں زمخشری کہتا ہے: القربی مصدر کالزلفی والبشری، بمعنی القرابہ

المراد فی الایہ اہل القربی الکشاف، ج۳، ص۸۱، سورہ شوری کی آیت ۲۳ کی تفسیر کی ذیل میں

[8] یہ تفسیر آیت کے مفہوم کو:، ان امور سے محبت کرنا جو انسان کو قرب الٰہی کی دعوت دیتے ہیں جانتی ہے

[9] البتہ اس نظریہ میں ایک اور مشکل بھی ہے، کہ اس کو اپنی جگہ پر بیان کیا گیا ہے، مثال کے طور پر محبت و مودت کی تعبیر اس معنی کے مناسب نہیں ہے، کیونکہ جو قرب الٰہی کا سبب ہے نماز و... پر عمل کرنا ہے نہ ان کی محبت و مودت اور اس کے علاوہ کیا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مخاطبین میں کوئی ایسا فرد تھا جو ان امور سے دلچسپی نہیں رکھتا تھا اور آیت اس کے بارے میں نازل ہوئی ہوتا کہ... (ملاحظہ ہو: المیز ان، ج۱۸، ص۴۶ ۴۵، تفسیر موضوعی پیام قرآن، ج۹، مکارم شیرازی، ص۲۳۷ ـ ۲۲۵)

[10] ملاحظہ ہو: طباطبائی، محمد حسین، تفسیر المیز ان، ج۱۸، ص۴۵ و۴۶

[11] چونکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ماں کی جانب سے اور سلمی بنت زید النجاریہ کی جانب سے انصار کے ساتھ قرابت رکھتے تھے

[12] مثلا اعراب کہتے ہیں: بنو نا بنو ابنا ئنا و بنا تنا بنو ھن ابنا ء الرجال الاباعد یعنی ہماری بیٹیوں کے فرزند، اجنبی مردوں کے فرزند ہیں

[13] ملاحظہ ہو: المیز ان، ج۱۸،ص ٤٥ ٤٣ تفسیر موضوعی پیام قرآن، ج۹،ص ٢٣٧ ٢٢٥

[14] سورہ توبہ۔ ۱۱۳ نبی اور صاحبان ایمان کی شان یہ نہیں ہے کہ وہ مشرکین کے حق میں استغفار کریں چاہے وہ ان کے قرابتدار ہی کیوں نہ ہوں

[15] جو کچھ بھی اللہ نے اہل قریہ کی طرف سے اپنے رسول کو دلوایا وہ سب اللہ، رسول اور رسول کے قرابتدارو... کے لئے ہے

[16] ملاحظہ ہو: مفاہیم القران، ج۱۰،جعفر سبحانی،ص ٢٦٩ ـ ٢٦٨

[17] اس احتمال کی نہ صرف خود آیت میں تائید نہیں ہوتی ہے بلکہ اجر رسالت سے بھی متناسب نہیں ہے اس کے علاوہ کیا قریش کے تمام افراد (اگر آیت کا خطاب قریش کی طرف ہو) تمام انسان (اگر آیت کا خطاب عام لوگوں سے ہو) مومنین کے ساتھ رشتہ داری رکھتے ہیں کہ محبت کی راہ سے انہیں اجر رسالت دیا جائے ملاحظہ ہو: المیز ان، ج۱۸،ص ٤٥ ، پیام قرآن، ج۱۰،ص ٢٣٧ ٢٢٥

[18] ہود۔ ۲۹ و۵۱ ،شعراء۔۱۰۹ و۱۲۷و۱٤٥و۱٦٤و ۱۸۰

[19] انعام۔ ۹۰

[20] فرقان۔ ٥٧ قُلۡ مَآ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ مِنۡ اَجۡرٍ اِلَّا مَنۡ شَآءَ اَنۡ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيۡلًا۝۵۷
آپ کہہ دیجئے کہ میں تم لوگوں سے کوئی اجر نہیں چاہتا مگر یہ کہ جو چاہے وہ اپنے پروردگار کا راستہ اختیار کرے یعنی میری اجرت یہی ہے کہ تم میں ہرایک خدا کی راہ کو اپنائے اور میری دعوت کو اختیار سے قبول کرے، پس دعوت کے علاوہ، کسی قسم کی اجرت کا وجود نہیں ہے

[21] سباء۔٤٧ قُلۡ مَا سَاَلۡتُكُمۡ مِّنۡ اَجۡرٍ فَهُوَ لَـكُمۡ‌ ؕ اِنۡ اَجۡرِىَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ‌ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ شَهِيۡدٌ‏۝۴۷

[22] ملاحظہ ہو: المیز ان، ج۱۸،ص۲ ٤ ٤٩ ، مفاہیم القرآن ج۱۰،ص ٢٧٤ ٢٦١ ، پیام قرآن، ج۹، ص ٢٢٥ ـ ٢٣٧

[23] السیر ہ النبو یہ، ج۱،ص ٢٩٤ ٢٩٣ شیخ مفیدؒ اس سلسلہ میں فرماتے ہیں: عمل خدا کے لئے اور مخلصانہ

ہونا چاہئے اور جو کچھ خدا کے لئے ہے، اس کا اجر بھی خدا پر ہے نہ کہ کسی اور پر اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی پوری زندگی میں ایسے ہی تھے (تصیح الاعتقاد، ص ٦٨)

[24] حضرت امام صادق علیہ السلام ایک روایت میں فرماتے ہیں: ما احب اللہ عز وجل من عصاہ. اس کے بعد یہ شعر پڑھا. تعصی الالہ وانت تظہر حبہ

هذا محال فی الفعال بدیع

لو کان حبك صادقا لاطعته

ان المحب لمن یحب مطیع

(سفینتہ البحار، مادہ حبب) یعنی محبت اطاعت کی مراد میں ہے اور اطاعت ہدایت کی مراد میں اور اسے دعوت قبول کرنا کہتے ہیں جو سورہ فرقان کی آیت نمبر ٥٧ میں آیا ہے

[25] آیہ مباہلہ میں علیؑ کی نفس پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تعبیر کی گئی ہے

[26] ان الحسین مصباح الہدی وسفینہ النجاہ سفینہ البحار، ج١، ص ٣٨٧۔

[27] سنائی: بحر پر کشتی است لیکن جملہ را گرداب خوف

بی سفینہ نوح نتوان چشم معبر داشتن۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا مثل اهل بیتی فیکم مثل سفینہ نوح، من رکبها نجا کنزل العمال، ج٦، ص ٢١٦ ملاحظہ ہو: اہل بیت مقامہم، منہجہم،، مسارہم، ص ٤٤٦

[28] پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا انا مدینہ العلم و علی بابها ...

[29] دعائے ندبہ میں آیا ہے فکانوا هم السبیل الیك والمسلك الی رضوانك

[30] شواہد التنزیل، ج٢، ص ١٣٠ و ١٣٥ و ١٣١١ و ١٤١

[31] الدر المنثور، ج٦، ص ٧

[32] احقاق الحق، ج٣، ص ٢، غایہ المرام، تفسیر آیہ

[33] تفسیر کشاف،، ج٤، ص ٢٢١ ٢٢٠

[34] تفسیر کبیر مخر رازی، ج٢٧، ص ١٦٧ ١٦٥

[35] ملاحظہ ہو: جوادی آملی، عبداللہ، تفسیر موضوعی قرآن کریم، ج٨، ص ٣٤١

ایک مسلمان کے ابتدائی ترین اعتقادات کیا ہیں؟

مختصر جواب

ہر انسان شہادتین کا اقرار کرنے، یعنی اشہد ان لا الہ الا اللہ واشہد ان محمدا رسول اللہ کہنے سے ایک شخص مسلمان شمار ہوتا ہے اور اس پر مسلمان کے احکام جاری ہوتے ہیں: اس کا بدن پاک اور اس کے بچے بھی پاک ہوتے ہیں اور ایک مسلمان عورت سے اس کی شادی اور مسلمانوں کے ساتھ اس کا لین دین مباح ہوجاتا ہے اس اقرار کا لازمہ، اہم فرائض دینی پر عمل کرنا ہے جو عبارت ہیں: نماز، روزہ، خمس، زکوات، حج، غیب پر ایمان، ملائکہ و معاد، بہشت وجہنم اور تمام انبیاء کو خدا کے رسولوں کی حیثیت سے قبول کرنا وغیرہ ہیں۔

اس کے علاوہ قرآن مجید کے احکام اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سفارشات اور ائمہ معصومین علیہم السلام کی تاکیدات کے پیش نظر ولایت ائمہ اثنا عشر (بارہ اماموں کی ولایت) کو قبول کئے بغیر، یہ اسلام اور اس کے احکام پر عمل کرنا مکمل ایمان محسوب نہیں ہوتا ہے اور قابل قبول نہیں ہے اس سے واضح ہے کہ باطن میں بھی مشرک و منافق نہیں ہونا چاہئے، کیونکہ صرف اس کے ظاہری اعمال اس کے لئے فائدہ بخش نہیں ہیں، وہ اسے خدا کے غیض وغضب سے دوچار کرتے ہیں اور اس کے لئے کسی قسم کا کمال اور سعادت فراہم نہیں کرتے ہیں

تفصیلی جواب

اسلام لغت میں تسلیم وفرمانبرداری کے معنی میں ہے اور اصطلاح میں، یہ ایک دین

ہے جو خداوند متعال کی طرف سے حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ آخری شریعت الٰہی کے عنوان سے لایا گیا ہے جو ایک وسیع، آفاقی اور لافانی (قیامت تک ناقابل منسوخ) دین ہے۔ اہم ترین چیز جو اس دین کو دوسرے ادیان پر امتیاز بخشتی ہے، یہی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاتمیت پر اعتقاد اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے مندرجہ ذیل ابعاد میں خالص توحیدی معارف پیش کرنا ہے:

الف) توحید ذاتی: خداوند متعال یکتا ہے اس کا نہ کوئی شریک ہے اور نہ ہم پلہ وہ مختلف اجزاء کا مرکب نہیں ہے۔

ب) خالقیت وربوبیت: میں توحید: عالم ہستی کا خالق اور اسے مستقل طور پر چلانے والا صرف وہ ہے، دوسرے، حتی ملائکہ اس کے کارندے اور بندے ہیں جو وجود، خالقیت اور امور کے انتظام کرنے میں خداوند متعال کے اوامر کو نافذ کرنے والے ہیں۔

ج) تشریعی توحید: انسان کے لئے قانون سازیہ کا حق رکھنے والا تنہا مرجع خداوند متعال ہے اور دوسرے صرف خداوند متعال کی طرف سے انہیں دی گئی اجازت کے حدود میں، بیان، وضاحت اور تشریع کا اختیار رکھتے ہیں۔

د) الوہیت میں توحید: صرف وہی معبود اور شایان پرستش ہے، نہ کہ دوسرے طاغوت اور مخلوقات۔

اس لئے اسلام میں داخل ہونے کی شرط، ان دو اصولوں کا اقرار اور ان کی ضروریات کو قبول کرنا ہے کلمہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دین اسلام کا لب لباب اور جوہر ہے اور توحید کے تمام پہلوؤں کا حامل ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کا اقرار، اس کی خاتمیت اور اس کے دین کی خاتمیت کا اقرار اور دوسری تمام راہ و روش اور عادات کا انکار اور منسوخ کرنے

کے نتیجہ میں اس رسول الٰہی کی تمام تعلیمات اور اوامر ونواہی کے سامنے سر تسلیم خم ہونا ہے

لہٰذا جو شخص ان دو مطالب کی شہادت دیتا ہے، وہ تمام پارٹیوں، مکاتب اور ادیان سے جدا ہو کر مسلمانوں میں شامل ہوتا ہے اور اس پر ایک مسلمان کے احکام جاری ہوتے ہیں، جیسے اس سے شادی اور لین دین کرنا حلال اور جائز ہوتا ہے اور وہ خود اور اس کے بچے پاک ہوتے ہیں [1]، اس کی جان سب کے لئے محترم ہے اور اس کا دفاع کرنا اسلامی حاکم اور اسلامی معاشرہ کے ذمہ ہے۔ اس امر کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ مخفی شرک، جیسے: نفس پرستی، زر پرستی اور جاہ طلبی انسان کے اصطلاحی اسلام سے خارج ہونے کا سبب نہیں ہوتی۔

شیعہ اثنا عشری کے نقطہ نظر سے، آیات اور معصومین علہیم السلام کی روایات کے مطابق، رسول خدا صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے بعد بارہ اماموں کو امام اور ولی و وصی کے طور پر قبول کرنا بھی ایمان اور بارگاہ الٰہی میں اعمال کے قبول ہونے کی شرط ہے، کیونکہ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم اور قرآن مجید کو تحریف سے پاک وحی کے طور پر تصدیق کرنے کا لازمہ یہ ہے کہ قرآن مجید اور رسول اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی سفارشات اور تاکیدات پر مکمل طور پر عمل کیا جائے قرآن مجید اور رسول اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی سفارشات میں اہل بیت علیہم السلام سے تمسک پیدا کرکے ان کی اطاعت کرنا شامل ہے اور ائمہ علیہم السلام کی نافرمانی حقیقت میں خدا اور رسول خدا صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے اوامر کی نافرمانی ہے

قابل ذکر بات ہے کہ شیعوں کے اعتقادات کے مطابق: جس طرح گناہان کبیرہ کا مرتکب شخص کافر شمار نہیں ہوتا ہے اور اسلام کے دائرہ سے خارج نہیں ہوتا ہے، اسی طرح اہل سنت بھی ائمہ معصومین علیہم السلام کی ولایت کو قبول نہ کرنے کے سبب دین سے خارج نہیں ہوتے ہیں بلکہ وہ مسلمان ہیں اور ان کے ساتھ رابطہ رکھنے اور معاشرت برقرار کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے

لیکن خوارج گناہ کبیرہ کے مرتکب اور فاسق کو کافر جانتے ہوئے اس کا خون بہانا مباح جانتے تھے معتزلہ ان لوگوں کو نہ مومن جانتے تھے اور نہ کافر اور وہابی سجدہ گاہ پر سجدہ کرنے، ائمہ اطہارؑ کی ضریح چومنے اوران کی خاک تربت کو تبرک جاننے کو شرک کے مصادیق جانتے ہیں اور شیعوں کو مشرک کے عنوان سے مشہور کرتے ہیں!

لہٰذا ایک مسلمان اس وقت مکمل اسلام کا حامل ہے کہ جب:

(الف) توحید کو اس کے تمام ابعاد میں قبول کرے

(ب) نبی اکرمؐ کی رسالت اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاتمیت کا اعتقاد رکھتا ہو

(ج) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام اوامر و نواھی، من جملہ ولایت کے تسلیم اور قبول کرلے۔

(د) موت کے بعد زندگی کے اعتقاد کو قبول کرنا اور اس سلسلہ میں قرآن مجید، رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ولی علیہ السلام کی طرف سے بیان کئے گئے جزیئات اور اوصاف کو قبول کرنا۔

قرآن مجید نے ایمان کی حد کے بارے میں یوں خاکہ کھینچا ہے: نیکی وہ ہے کہ: ۱۔ خدا، ۲ قیامت، ۳۔ ملائکہ، ٤۔ کتاب اور ٥۔ انبیاء پر ایمان لایا جائے[2] اور آشکار کفر و نفاق اور شرک کو جہنم میں داخل ہونے اور اسلام و ایمان سے خارج ہونے کا سبب جانے ہے[3]۔

لیکن چونکہ حقیقی ایمان کا لازمہ قوانین شرع پر عمل کرنا ہے، خدا اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکام پر عمل کئے بغیر ایمان اور اسلام کا اظہار، اگر چہ اس پر اسلام کے ظاہری احکام جاری ہونگے، لیکن اس کو حقیقی ہدایت اور سعادت حاصل نہیں ہوگی۔ اس لئے قرآن مجید حیات طیبہ کو حاصل کرنے کی شرط ایمان اور عمل صالح کو ایک ساتھ مانتا ہے[4]

جو ان دو میں سے صرف ایک کا حامل ہو، یعنی ایمان کا دعویٰ کرتا ہے لیکن عمل نہیں کرتا ہے یا صالح ہے لیکن ایمان نہیں رکھتا ہے، وہ اس مرغ کے مانند ہے جس کا صرف ایک پر ہے اور وہ کبھی پرواز کر کے سعادت و کمال کی بلندیوں تک نہیں پہنچ سکتا ہے، مگر یہ کہ اپنی روش میں تبدیلی لائے اور اپنے ایمان کو عمل صالح سے اور عمل صالح کو اسلام کے اظہار اور اس کے معارف کو قبول کرنے سے انجام دے تا کہ اس راہ سے بارگاہ الٰہی کا تقرب حاصل کرے اور بہشت میں داخل ہو جائے۔

یہاں پر چند نکات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے:

(۱) ایمان اور عمل صالح کے درمیان ایک متقابل رابطہ ہے جس قدر ایمان قوی تر ہو، اس کے عمل صالح کی کیفیت و کمیت اور گناہ و سرکشی سے اجتناب بھی بیشتر ہوگا اور جس قدر اعمال صالح اور گناہان کبیرہ سے اجتناب کی طرف زیادہ توجہ کی جائے، دل میں ایمان بھی اسی قدر زیادہ نفوذ جگہ پیدا کرتا ہے یہاں تک کہ انسان سعادت کے کمال تک پہنچتا ہے اور انسانیت کی بلندی پر سرافراز وجلوہ گر ہوتا ہے۔ اور اس کے برعکس گناہ اور ان پر اصرار دل سے ایمان کے تدریجی طور پر محو ہونے کا سبب بن جاتا ہے اور گناہ کا مرتکب ہونا ایمان کی کمزوری کی نشانی ہے۔

(۲) دوسرے انبیاء اور ان کی اصلی کتابوں کی تصدیق کرنے کا لازمہ ان کی شریعت پر عمل کرنا نہیں ہے، کیونکہ ان میں سے بعض کی شریعت صرف ان کی قوم تک محدود تھی اور بعض دوسروں کی شریعت بھی بعد والی شریعت اور کتاب کے آنے سے منسوخ ہوئی ہے یعنی ان کے اختتام کی تاریخ گزر چکی ہے لہٰذا ان کی تصدیق انہیں انبیائے الٰہی کے طور پر قبول کرنے اور ان کے مقام و منزلت اور زحمتوں کا احترام کرنے کے معنی میں ہے، نہ ان کی شریعت پر عمل کرنے کے معنی میں۔

(۳) اہم عبادتی اعمال، جو ایک مسلمان کو غیر مسلمان سے جدا کرتے ہیں، فروع دین کے عنوان سے مشہور ہیں اور جن کے ذمہ یہ عبادتی تکالیف ہوں ان کے لئے ان کو یاد کرنا اوران سب پر عمل کرنا، ضروری ہے، اور ان میں سے کسی ایک کی بھی ضرورت کا انکار کرنا ضروریات دین کے انکار کے برابر ہے اس لئے ان میں سے ہر ایک کی ضرورت کا انکار بھی اسلام سے خارج ہونے کا سبب بن جاتا ہے اور اس کا مرتکب مرتد شمار ہوتا ہے اور خاص شرائط کے حامل ہونے کی صورت میں (ارتداد فطری، مرد ہونے اور...) اس کا خون بہانا مباح ہوتا ہے۔

دوسری طرف، ان کی ضرورت کا انکار کئے بغیر ان پر عمل نہ کرنا بھی انسان کے لئے بہشت کے درجات سے محروم ہونے کا سبب بن جاتا ہے اور اگر آخر عمر تک ان پر عمل نہ کرنے پر باقی رہے اور اس کی تلافی نہ کرے تو عذاب دائم کا مستحق بن جائیگا۔

(۴) ایمان مطلق ہونا چاہئے، کیونکہ اصولی طور پر ایمان منفک ہونے کے لائق نہیں ہے۔ اگر کوئی حقیقی معنوں میں مؤمن ہے تو وہ یہ نہیں کہہ سکتا ہے: میں نے معارف میں سے صرف ایک حصہ کو قبول کیا ہے اور احکام تکلیفی میں سے صرف بعض پر عمل کرتا ہوں، کیونکہ قرآن مجید کے مطابق اس قسم کا عمل نفس پرستی اور اپنے ذاتی خواہشات کے مطابق عمل کرنا ہے اور یہ کفر شمار ہوتا ہے، نہ کہ خدا، روز جزا اور انبیاء کی نبوت پر ایمان[5]۔

(۵) ایمان اور عمل صالح کے مختلف مراتب ہیں ان میں قوی اور ضعیف کی صورت بھی پائی جاتی ہے۔ تمام صالح مؤمنین ایک ہی درجہ پر نہیں ہوتے ہیں اور خدا کے سامنے اور بہشت میں سبھوں سب کا رتبہ یکسان نہیں ہے۔ لہٰذا ایمان کو گہرائی بخشنے اور عمل صالح کی کمیت وکفیت کو ارتقا کے منازل تک پہنچانے کے لئے حقیقی معارف کو حاصل کرنے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرنی چاہئے تا کہ بلند مراتب حاصل کئے جائیں۔

منابع وماخذ

سبحانی، جعفر، ملل ونحل، ج۲، مرکز مدیریت حوزہ، طبع دوم، قم، ۱۳۶۶، ص ۵۳.
شہرستانی، عبدالکریم، ملل ونحل، ج۱-۲، الانجلو مصر، طبع دوم، ۱۳۷۵ ق، مصر، ص۴۶.
سعیدی مہر، محمد، آموزش کلام اسلامی، ج۱ و۲، طہ، طبع دوم، سال ۸۱، قم، ص ۱۶۳-۱۶۱از جلداول وص ۱۳۵ از جلد دوم۔
طوسی، خواجہ نصیرالدین، کشف المراد، شکوری، طبع چہارم، سال ۷۳، قم، ص۴۰۴۔
مصباح یزدی، محمد تقی، آموزش عقاید، ج۳، سازمان تبلیغات اسلامی، طبع دوازدہم، سال ۷۶، قم، ص ۱۶۳-۱۲۶، دروس ۵۸-۵۴۔
مصباح یزدی، محمد تقی، اخلاق درقرآن ج۱، موسسہ آموزشی وتحقیقی امام خمینی قدس سرہ، قم، ص ۱۴۵-۱۲۲۔

حواشی

[1]۔ البتہ غیر مسلمان (اہل کتاب یا غیر اہل کتاب) کے بدن کی طہارت و پاکی کے بارے میں اسلامی علما کے نظریات میں اختلاف پایا جاتا ہے، مزید معلومات حاصل کرنے کے لئے ان کی توضیح المسائل کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔

[2] بقرہ۔ ۱۷۷و۲۸۵، نساء۔۱۳۶.

[3] نساء۔ ۱۴۵و۱۴۰

[4] نحل۔ ۹۷۔ بقرہ۔ ۱۰۳۔ نساء۔ ۱۲۲و۵۷.

[5]۔ بقرہ۔ ۸۵۔ نساء۱۵۱ تا۱۵۰.

قرآن مجید کے دفعتا اور تدریجی سے آج تک کتنا زمانہ گزرر رہا ہے؟

مختصر جواب

بیشک قرآن مجید پیغمبر اکرم (ص) کے قلب مبارک پر دفعتا شب قدر (ماہ مبارک رمضان کی ایک رات) میں نازل ہوا ہے بعض روایات اور قرائن کے مطابق،اس احتمال کو تقویت ملتی ہے کہ شب قدر ماہ مبارک رمضان کی وہی ۲۳ ویں شب ہےاور قرآن مجید کا دفعتا نزول بعثت کے تقریبا ٥٦ دن بعد انجام پایا ہے.

قرآن مجید کے تدریجی نزول کے بارے میں،کافی اختلافات پائے جاتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں دو بنیادیں زیادہ اہمیت کے حامل ہیں:

۱.قرآن مجید کا تدریجی نزول بعثت کے زمانے میں شروع ہوا ہے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آخری عمر تک جاری رہا مشہور نظریہ کے مطابق پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ۲۷ ۔رجب مطابق یکم فروری ٦١٠ء میں رسالت پر مبعوث ہوئے ہیں اور ۲۸ ۔صفر ٥١١ھ کو آپؐ نے رحلت فرمائی ہے.

۲.اگر چہ بعثت کے زمانے میں،قرآن مجید کی چند آیات نازل ہوئی ہیں لیکن کتاب آسمانی کے عنوان سےقرآن مجید کا تدریجی نزول،بعثت کے تین سال بعد،شب قدر

سے شروع ہوا ہے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آخری عمر تک جاری رہا.

اس بنا پر، چونکہ ہم اس وقت فروری ۲۰۰۷ء میں ہیں، اس لئے قرآن مجید کے تدریجی نزول کے آج تک گزرے سالوں کے بارے میں آسانی کے ساتھ حساب کر سکتے ہیں.

تفصیلی جواب

ہم قرآن مجید کے دفعتاً نزول کے بارے میں صرف اتنا جانتے ہیں کہ شب قدر میں نازل ہوا ہے[1] اور چونکہ قرآن مجید فرماتا ہے:[2] ماہ رمضان، وہ مہینہ ہے جس میں قرآن مجید نازل ہوا ہے، لہٰذا شب قدر بھی ماہ رمضان میں ہے.

لیکن یہ شب قدر ماہ رمضان کی راتوں میں سے کونسی رات ہے، پورے طور پر نہیں ہے اور اس سلسلہ میں اختلافات پائے جاتے ہیں [3]، لیکن ایسا لگتا ہے کہ اس سلسلہ میں موجود احتمالات کے درمیان، شب قدر کے ۲۳ ویں شب کو ہونے کا احتمال قوی تر ہے، کیونکہ اس شب کی زیادہ روایات اور قرائن سے تائید ہوتی ہے[4].

پھر بھی مشخص نہیں ہے کہ کس سال میں یہ مبارک امر انجام پایا ہے.لیکن اتنا ضروری کہا جاسکتا ہے کہ:اگر چہ شب قدر،فطری طور نزول قرآن کی شب تھی،لیکن پیغمبر اکرم(ص) کے معراج کی رات بھی شب قدر شمار ہوتی تھی، کیونکہ قرآن ام لکتاب کی صورت میں، پروردگار عالم کے پاس موجود ہے.[5] اور جب تک انسان معراج نہ کرے قرآن کو ام الکتاب میں نہیں پاسکتا ہے.[6] یہاں سے معلوم ہوسکتا ہے کہ قرآن مجید کا دفعتا نازل ہونا اس زمانہ میں انجام پایا ہے جب پیغمبر کمال کے اس مرحلہ پر پہنچ گئے تھے.اس بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ یہ ظہور رسالت کے اسی پہلے سال، یعنی بعثت کے تقریبا ۵٦ روز بعد واقع ہوا ہے.

یہ عدد بعثت کا زمانہ (۲۷۔رجب) اور شب قدر (۲۳۔رمضان) کو مدنظر رکھنے اور

رجب وشعبان کے ہر مہینہ کے ۳۰ دن کے فرض کرنے پر حاصل ہوا ہے .

قرآن مجید کے تدریجی نزول[7] کے سلسلہ میں، جو بعثت کے زمانہ میں تھا، بعثت کی صحیح تاریخ کے سلسلہ میں اختلافات کی وجہ سے[8] بھی اختلاف نظر پایا جاتا ہے.

مشہور نظریہ ہے کہ پیغمبر عظیم الشانؐ سوموار، ۲۷ رجب مطابق یکم فروری ٦١٠ ءکو رسالت پر مبعوث ہو.ے ہیں [9] اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سورہ علق کی پہلی پانچ آیات نازل ہوییں .[10] اس کے بعد قرآن مجید کی دوسری آیات کا نزول تدریجا آنحضرتؐ کی آخری عمر تک یعنی ۲۳ سال تک انجام پایا.

بعض لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ ایک آسمانی کتاب کے عنوان سے بعثت کے زمانہ اور قرآن مجید کے تدریجی نزول کے زمانہ کے درمیان، فرق ہے .ان کی نظر میں اگر سورہ علق کی پہلی پانچ آیتیں بعثت کے زمانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی ہیں، لیکن آنحضرتؐ عام تبلیغ کرنے پر مامور نہیں تھے .آپؐ تین سال تک مخفی طور دعوت کے بعد عام دعوت کے لئے مامور ہوئے [11] اوراس زمانہ سے قرآن مجید آسمان سے نازل ہونے والی کتاب کے عنوان سے کتابت کی ہوئی صورت میں رونما ہوئی اور...اس لحاظ سے اگرچہ بعثت ماہ رجب میں تھی، لیکن قرآن مجید کا تدریجی نزول، تین سال کے بعد، ماہ رمضان میں شب قدر میں شروع ہوا ہے.[12]

اس عقیدہ کی تائید وہ روایات کرتی ہیں جو قرآن مجید کے تدریجی نزول کو بیس سال کی مدت بتاتی ہیں .[13] اس نظریہ وعقیدہ کے مطابق.[14] کتاب آسمانی کے عنوان سے قرآن مجید کے تدریجی نزول کا زمانہ بعثت کا چوتھا سال تھا، یعنی بعثت کے تین سال اور چھپن دن بعد تھا اور آنحضرتؐ کی آخری عمر یعنی ۲۸ صفر ۱۱ ہجری تک جاری رہا.

نتیجہ کے طور پر، چونکہ آج تک پیغمبر اکرمؐ کی ہجرت کو ۱٤۲۸ سال گزرے ہیں اور

پیغمبرؐ کی بعثت، ہجرت سے تقریبا تیرہ سال پہلے تھی، لہٰذا اگر پہلے نظریہ کو قبول کریں تو پہلی آیت کو نازل ہونے سے آج تک ۱٤٤۰ قمری سال گزرے ہیں اور اگر دوسرے منبا کو قبول کریں تو پہلی آیت کے نزول سے آج تک ۱٤۳۷ سال گزرے ہیں.

قابل ذکر بات ہے کہ بعض مورخین کے بیان کے مطابق آنحضرتؐ کی بعثت کا زمانہ یکم فروری ٦۱۰ء تھا اور چونکہ اس وقت ۲۰۰۷ء ہے. اس لئے پہلی آیت کے نزول کے زمانہ کا عیسوی سال کے مطابق بھی آسانی کے ساتھ حساب کر سکتے ہیں.

حواشی

[1] دخان۔۳، قدر۔۱، مزید مطالعہ کے لئے ملاحظہ ہو: المیزان، ج۸، ص۱۳۰۔۱۳٤، ج۲، ص۱٤۔۲۳، ج۱۳، ص۲۲۰ و۲۲۱.

[2] بقرہ۔۱۸۵.

[3] ملاحظہ ہو: تاریخ طبری، ج۲، ص۳۰۰، سیری ای ابن ہشام، ج۱، ص۲۳٦ و۲۳۹ و۲٤۰، آیت اللہ معرفت، التمہید فی علوم القرآن، ص۱۰۰.۱۲۹، آیت اللہ خوئی، البیان، ج۱، ص۲۲٤، مجمع البیان، ج۹، ۲۲٤، مجمع البیان، ج۹، ص٦۱ وج۱۰، ص۵۱۸.۵۲۰، تاریخ ابی الفداء، ج۱، ص۱۱۵، تاریخ یقوبی، ج۲، ص۱۷، شیخ طوسی، التبیان، ج۹، ص۲۲٤، محمد بن جریر طبری، جامع البیان، ۲۵، ۱۰۷ و۱۰۸، المیزان، ج۲، ص۲۹.

[4] وسایل الشیعہ، باب ۳۲ از ابواب احکام ماہ رمضان، ۷، ۲٦۲، ۱٦، خصال صدوق، ج۲، ص۱۰۲، محمد باقر حجتی، تاریخ قرآن پر ایک تحقیق ص۳۸.٦۲.

[5] سورہ زخرف۔٤.

[6] ملاحظہ ہو: آیت اللہ جوادی، تفسیر موضوعی، ج۳، ص۱۳۹.۱۵۳.

[7] سورہ اسراء۔۱۰٦، سورہ فرقان۔۳۲، سورہ محمد۔۲۰، سورہ توبہ۔۱۲۷، مزید معلومات کے لئے ملاحظہ ہو: المیزان، ج۲، ص۱٤.۲۳.

[8] تاریخ یعقوبی، ج۲، ص۱۷، تاریخ الخمیس، ج۱، ص۲۸۰ و۲۸۱، تاریخ ابی الفداء، ج۱، ص۱۱۵.

[9] تاریخ قرآن پر ایک تحقیق ص۳٦، بحار، ج۱۸،ص۱۸۹، ح۲۱،فروع الکافی، ٤، ۱٤۹، ح۱و ۲، وسائل الشیعه، ج۷،ص۳۲۹، باب ۱٥ازابواب صوم مندوب،السیر ه الحلبیه، ۱، ۲۳۸،التمهید فی علوم القرآن، ۱۰۷.۱۰۰.

[10] بحارالانوار، ج۱۸،ص۲۰٦، ح۳٦.

[11] سوره حجر۔۹٤،تفسیرقمی،ص۳٥۳، بحار، ج۱۸، ص٥۳، ح۷وص۱۷۹، ح۱۰وص۱۷۷، ح٤وص۱۹۳، ح۲۹، ترجمه آیتی، ج۱،ص۳۷۹، تاریخ یعقوبی، ج۱،ص٤۳ ۳، السیر ه ابن هشام، ج۱، ص۲۸۰، المناقب، ج۱،ص٤۰، شیخ طوسی، الغیبه،ص۲۱۷.

[12] ملاحظہ ہو: مجمع البیان، ج۲،ص۲۷٦، الاتقان، ج۱،ص٤۰،تفسیر کبیر امام رازی، ج٥،ص۸٥، المناقب، ج۱،ص۱٥۰، شیخ مفید شرح عقاید صدوق،ص٥۸، سید مرتضی در جواب المسایل الاطرابلسیات الثلاثه،ص٤۰٥۔٤۰۳

[13] الاصول من الکافی، ج۲،ص٦۲۸، ح٦،تفسیر عیاشی، ج۱،ص۸۰، ح۱۸٤،صدوق، الاعتقادات، ص۱۰۱، بحار، ج۱۸،ص۲٥۰، ح۳وص۲٥۳، الاتقان، ج۱،ص٤۰ و٤٥،تفسیر شبر،ص۳٥۰، مستدرک الحاکم، ج۲،ص٦۱۰، اسباب النزول،ص۳، البدایه والنهایه، ج۳،ص٤، تاریخ یقوبی، ج۲،ص۱۸

[14] مزید آگاہی کے لئے ملاحظہ ہو: کتاب: التمهید فی علوم القرآن،ص۱۰۰۔۱۲۹.

کسی گناہ کے مرتکب ہوئے بغیر نوجوان کا حضرت خضر کے ہاتھوں قتل کئے جانے کی کیا توجیہ کی جا سکتی ہے؟ کیا یہ کام سنت الٰہی کے منافی نہیں ہے؟

سورہ مبارکہ کہف کی آیت نمبر ۸۰ میں حضرت خضر علیہ السلام اس نوجوان کے قتل کی وجہ کے بارے میں وضاحت کرتے ہیں، خداوند متعال کی اس سنت کے مطابق کہ جب تک نہ انسان کسی جرم کا مرتکب ہو جائے، وہ عمل ثبت اور قابل مجازات نہیں ہے، اس کے پیش نظر چند سوالات پیدا ہوتے ہیں:

۱)اس کے باوجود کہ خداوند متعال علم رکھتا تھا کہ یہ نوجوان مستقبل میں ایک جرم کا مرتکب ہوگا، لیکن (سنت الٰہی کے مطابق) اسے کیوں مہلت نہیں دی گئی تا کہ مستقبل میں خود اپنے برے کام کا گواہ بن جاتا؟ کیا یہ جبر نہیں ہے؟

۲) کیا اس نوجوان پر اپنے مومن والدین کی وجہ سے خدا کی مہربانی شامل ہوئی اور جرم کا ارتکاب کرنے سے پہلے اس دنیا سے چلا گیا تا کہ اس پر کوئی عذاب نہیں ہوگا؟

۳) یا یہ کہ چونکہ خداوند متعال علم رکھتا تھا کہ وہ مستقبل میں جرم کا مرتکب ہوگا اس لئے قیامت کے دن سزا پائے گا؟

مختصر جواب

آیات، روایات اور تفاسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خضر کے ہاتھوں جوان کے قتل ہونے کا قضیہ، غضب اور ہواوہوس کی وجہ سے نہیں تھا، بلکہ یقینی طور پر یہ قتل ایک فلسفہ، حکمت اور مصلحت کی بنا پر تھا، خاص کر اس لئے کہ یہ قتل خدا کے بندوں میں سے ایک ایسے صالح بندہ کے ہاتھوں انجام پایا، جس کا دل رحمت الٰہی سے لبریز تھا۔

چنانچہ خود حضرت خضر، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اعتراض کے جواب میں فرماتے ہیں: ارادہ وحکمت الٰہی ہر چیز سے برتر ہے سادہ اندیش آدمی کی عقل امر الٰہی کی باریک بینیوں کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ اسی وجہ سے عقلیں خدا کے ارادہ پر حاکمیت نہیں رکھتی ہیں اور عقل کی نسبت اس کا امر وارادہ حاکم اور تعین کنندہ ہے۔ اس بنا پر، صرف عقل اور اس کے ظاہر کو سند نہ سمجھنا اور فی الحال جو بھی کام میں انجام دوں گا اسے صبر وشکیبائی سے قبول کرنا۔

دوسرے الفاظ میں، اس جوان کا قتل ہونا، سو فیصد ایک خاص حکم اور حکم الٰہی کے تحت تھا اور حضرت خضر نے خدا کے حکم کے بغیر اس عمل کو انجام نہیں دیا ہے، بلکہ وہ خدا کے حکم کو نافذ کرنے والے ہیں۔

اور بعض اوقات خداوند متعال اپنے ارادہ کے مطابق بعض برتر مصلحتوں کے تحت، ظاہری جزا کے حدود سے بالاتر عمل کر کے اس کے باطنی ابعاد کے نتائج اور عذاب و پاداش کا فیصلہ کرتا ہے۔

اس سلسلہ میں آیات وروایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مصلحتیں عبارت تھیں:

۱) چونکہ یہ بیٹا مسلمان والدین سے پیدا ہوا تھا، اس کا کفر مستقبل میں اس کے ارتداد کا سبب بن جاتا اور اس کے ارتداد کی دنیوی سزا (حضرت خضر کے ہاتھوں قتل ہونا) اس کی آخروی سزا میں تخفیف کا سبب بن جاتی۔

۲) خداوند متعال کو علم تھا کہ اس بیٹے کا زندہ رہنا معنوی اور مادی نقصان کے علاوہ کچھ نہیں ہے. یہ شخص زندہ رہ کر، اپنے والدین کو کافر بناتا اور ان دونوں کے ارتداد کا گناہ بھی اس کے ذمہ ہو جاتا.

۳) بیٹے کا زندہ رہنا اس کے والدین کے ایک اور خیر کے لئے رکاوٹ کا سبب بن جاتا، یعنی ان کو خدا کی طرف سے بیٹی عطا ہونا جس کی نسل سے انبیاء وجود میں آتے. اس قتل سے اس کے والدین کا ایمان بھی محفوظ رہا اور ایک بدکردار بیٹے کے بجائے ایک پاک و پاکیزہ، ہمدرد اور بابرکت بیٹی بھی ملی اور اس طرح یہ والدین ستر انبیاء کے جد بننے کی توفیق بھی حاصل کر سکے اور ان کے ثواب و مغفرت سے بہرہ مند بھی ہوئے.

نتیجہ یہ کہ اس جوان کو مہلت نہ دینے کی حکمتوں میں سے، یہی باعظمت انبیاء کی نسل کی مصلحت ہے.

واضح ہے کہ سنت الٰہی والدین انبیاء کے ایمان سے متعلق ہے۔ تعلق پائی ہے اسی وجہ سے اگر بیٹا زندہ رہتا اور والدین کے کفر وغیرہ... کا سبب بن جاتا، تو حقیقی معنوں میں اس سنت کی راہ میں رکاوٹ بن جاتا.

تفصیلی جواب

تفاسیر، روایات اور آیات کے سیاق کی وضاحتوں سے معلوم ہوتا ہے، کہ غلام (تازہ بالغ جوان) (1) کے قتل کا واقعہ ایک اتفاقی یا غضب و کشمکش پر مبنی امر نہیں تھا، بلکہ حضرت خضرؑ نے بغیر کسی مقدماتی گفتگو کے جوان کو قتل کرنے کا اقدام کیا ہے (۲). اس لحاظ سے اس سلسلہ میں نفسیاتی خواہشات اور غضب کا شائبہ نہیں ہے اور انسان کا سوال کنندہ ذہن قبول کرتا ہے کہ کسی قسم کے جذباتی اور اکسانے والے عوامل کی عدم موجودگی میں اس عمل کے انجام پانے میں یقینی طور پر کوئی حکمت اور خاص دلیل کارفرما تھی اور حضرت خضرؑ نے اس امر

میں نفسانی خواہشات کی پیروی نہیں کی ہے. خاص کر جب یہ عمل ایک ایسے شخص کے توسط سے انجام پایا ہے کہ قرآن مجید ان کے بارے میں فرماتا ہے:...عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا۝۶۵ ..تو اس جگہ پر ہمارے بندوں میں سے ایک ایسے بندے کو پایا جسے ہم نے اپنی طرف سے رحمت عطا کی تھی اور اپنے علم خاص میں سے ایک خاص علم کی تعلیم دی تھی.(۳)

اس لئے، مذکورہ اشاروں کے پیش نظر یقین کیا جاسکتا ہے کہ اس کام میں ہوا وہوس کا عمل دخل نہیں تھا، لیکن اس کا فلسفہ کیا تھا؟ اور یہ کیسے باور کیا جاسکتا ہے کہ ایسا شخص ایک تازہ بالغ نوجوان کو قتل کرنے کا اقدام کرے؟ اس کے لئے جواب کی ضرورت ہے جس کو ہم اسی بحث کے سلسلہ میں پیش کریں گے.

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس ماجرا کو دیکھ کر انتہائی تعجب کیا، چونکہ وہ اس واقعہ کے ظاہر کو دیکھتے ہوئے قتل کو بے جا جانتے تھے، اس لئے حضرت خضر سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ: آپ نے ایک پاک و بے گناہ انسان کو قصاص کا مستحق ہوئے بغیر قتل کر ڈالا؟! یہ قابل قبول نہیں ہے اور آپ نے ایک ناشائستہ کام انجام دیا ہے! اس حالت میں حضرت خضرؑ اجمالی صورت میں اپنے کام کی وجہ بیان کرتے ہیں اور فرماتے ہیں: خداوند متعال کا ارادہ اور حکمت ہر چیز سے برتر ہے اور ایک سادہ اندیش انسان کی عقل خدا کے ارادہ اور اس کے امر کی باریک بینیوں کو نہیں سمجھ سکتی ہے، اسی لئے عقلیں خدا کے ارادہ کو سمجھنے سے قاصر ہیں اور اس کا امر اور ارادہ عقلوں کی بہ نسبت حاکم اور فیصلہ کن ہے. اس بنا پر آپ صرف عقل اور ظاہر پر اعتبار نہ کریں اور فی الحال جو بھی کام میں انجام دوں اس کو صبر و شکیبائی سے قبول کریں...(٤)

ہم اس حدیث پر غور وخوص کرنے کے بعد یہ نتیجہ پاتے ہیں کہ:

(۱)امور کا ایک ظاہر ہوتا ہےاور ایک حقیقت .اگر برائیوں اور گناہوں سے بھری ایک حقیقت پر نیکیوں اور بے گناہیوں کا ظاہری لیبل لگا ہو،توصرف ظاہری احکام سند نہیں بنایا جاسکتا ہے.

(۲)کبھی خدا وند متعال فیصلہ کرتا ہے کہ بعض برتر مصلحتوں سے استناد اور ظاہری جزا کے حدود سے بالاتر عمل کر کے قضیہ کے باطنی پہلو کے مطابق اس کے عذاب و پاداش کا ارادہ کرے.

(۳)اس جوان کا قتل ہونا،سو فیصد حکم الٰہی کے مطابق تھا اور حضرت خضرؑ نے خدا کے حکم کے بغیر یہ اقدام نہیں کیا ہے، بلکہ وہ خدا کے حکم کو نافذ کرنے والے ہیں (۵).

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ: کیا خداوند متعال نے اس جوان کو قتل کر کے،جرم سے پہلے سزا (قصاص)نہیں دی ہے؟ درج ذیل مطالب اس سوال کے جواب میں ہماری مدد کرسکتے ہیں:

(الف)اگر انسان،مومن ماں باپ سے پیدا ہوکر بالغ ہونے کے بعد اپنے ایمان سے انکار کرے،تو وہ مرتد فطری کے زمرے میں آتا ہےاور ایسا شخص مرد ہو تو قتل کا مستحق ہو گا .متعدد روایات میں آیا ہے کہ:اگر چہ قرآن مجید کی صراحت کے مطابق،اس جوان کے ماں باپ،مومن تھے،لیکن ان کا بیٹا کافر تھا اور اس حد تک کہ اس کے دل میں نور کی کرن پیدا ہونے کی کوئی امید باقی نہیں رہی تھی اور وہ ایمان کو قبول کرنے کے سلسلہ میں ہٹ دھرم بن چکا تھا(٦)اس لحاظ سے،اگر چہ بچوں کے ساتھ کھیل کود کے دوران،اس کی ظاہری روش سے کفر نمایاں نہ تھا(جس کی وجہ سے حضرت موسیٰ اس کے ظاہر پر بنا کر کے اسے پاک و بے گناہ جانتے تھے)لیکن اس کی قلبی اعتقادی اور عملی حقیقت،اس کے کفر کو ثابت کرتی تھی (چنانچہ علم الٰہی اور اس کے بارے میں حضرت خضر کو مطلع کرنے سے ثابت

ہو چکا تھا) نتیجہ کے طور پر، اس کا قتل ہونا اس کے ارتداد کو اختیار کرنے کا ردعمل تھا کہ دنیا میں ایسے جرم کی سزا، موت کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

(ب) خداوند متعال جانتا تھا کہ اس جوان کے زندہ رہنے کا نتیجہ، اپنے باایمان والدین کو گمراہ کرنے، خاندانی رشتہ کو توڑنے، اور خاندان و معاشرہ کو دنیوی برکات اور اخروی ایمان سے محروم کرنے کے معنوی و مادی نقصان کے علاوہ کچھ نہیں تھا، اس لئے اس کی زندگی کو ختم کرنے کا ارادہ کیا اور اس کی جان لینے کے اسباب فراہم کئے۔ جس طرح انسان کسی چیز کے فائدہ کا پلہ بھاری ہونے تک اس کی حفاظت کرتا ہے اور اس کے بعد اسے اپنے ہاتھوں سے ختم کر دینا پسند کرتا ہے! اس سلسلہ میں اگر چہ روح کو قبض کرنے والے حضرت عزرائیل اور ان کے دوسرے خدمت گزار ہوتے ہیں، لیکن خداوند متعال نے ارادہ کیا کہ اس کے ارادہ کو ظاہری عملی جامہ پہنانے (یعنی جوان کی زندگی کو ختم کرنے) والا اس کا ایک منتخب، رحمت والا اور خصوصی علوم کا عالم بندہ یعنی حضرت خضر ہو۔

دوسرے الفاظ میں، حضرت خضر علیہ السلام کا اقدام، خداوند متعال کے اسی تشریعی یا تکوینی ارادہ کی بنیاد پر ہے کہ اس جوان کی موت کے بارے میں ثابت ہوا اور اس لحاظ سے یہ قتل دوسری ایسی اموات کے زمرے میں ہے کہ تصادف وغیرہ کے نتیجہ میں رونما ہوتے ہیں .(اس تفاوت کے ساتھ کہ تصادفات سے واقع ہونے والے قتل، نظام تشریع کے نقطہ نظر سے، خدا کی تائید کے مطابق نہیں ہوتے ہیں اور خدا ان کے بارے میں کوئی امر نہیں کرتا ہے، لیکن زیر بحث قتل اور دوسرے فطری اموات تشریعی اور تکوینی زاویوں سے (فطری سبب سازی سے) خدا کے اشارہ اور تائید سے ثابت ہوتے ہیں)

اس معمہ کو حل کرنے کے سلسلہ میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: خضر علیہ السلام اس فکر میں تھے کہ ایسا نہ ہو کہ کام کی نوعیت ایسی شکل اختیار کرے کہ ان کے اور ان

کو دیئے گئے حکم پر امر ہوئے قضیہ کے درمیان کوئی رکاوٹ پیدا ہوجائے، اس طرح کہ وہ خدا کے ارادہ یعنی نوجوان کو قتل کرنے (جس کا آغاز اور انتہا لطف و مصلحت الٰہی پر مبنی ہے نہ کہ انسان کے حق پر) کے ثواب سے محروم ہوجائیں. خاص کر یہ کہ اس امر کو نافذ کرنا، ایک اور سبب کو پیدا کرنے والا تھا، یعنی اس جوان کے والدین پر رحمت کی عنایت (چونکہ قرآن مجید کی صراحت کے مطابق حضرت خضر جانتے تھے کہ خداوند متعال اس جوان کے بدلے میں، اس کے ماں باپ کو ایک ایسی بیٹی عطا کرنے والا ہے جو پاک و پاکیزہ اور خاندان کی یکجہتی اور رابطہ کا سبب ہوگی) اس کے علاوہ، اس ارادہ الٰہی کا پایہ تکمیل تک پہنچنا، سبب بن جاتا تا کہ حضرت خضرؑ اسرار الٰہی کو افشا کرنے اور حقائق اور خدا کے خاص علوم کو حضرت موسیٰ کے سامنے بیان کرنے کی توفیق پیدا کرتے قابل توجہ بات ہے کہ حضرت خضرؑ فلسفہ اور حکمت بیان کرنے کے دوران فرماتے ہیں: بہر صورت، ہمیں اس بات کا خوف تھا کہ جوان زندہ رہنے کی صورت میں سرکشی اور ضد سے اپنے والدین کو بھی کفر کی طرف لے جاتا یعنی حضرت خضر اس کام کی روش اور نتیجہ کے بارے میں اپنے اور اپنے ذاتی ارادہ کا نام نہیں لیتے ہیں اور فعل جمع میں سے استفادہ کرتے ہیں تا کہ یہ دکھائیں کہ اگر چہ میں خدا کے ارادہ کو عمل شکل دینے والا تھا، لیکن اس کام میں، تنہا نہیں تھا، بلکہ ارادہ اور حمایت الٰہی اور اس کی بارگاہ کا توسط، میرے ساتھ شریک تھے. اس فرق کے ساتھ کہ خداوند متعال پر خوف طاری نہیں ہوتا ہے لیکن خضر (ع) اور دوسرے لوگ خوف وترس سے خالی نہیں ہیں (حکم کے صدور اور نفاذ میں شراکت. احکام الٰہی کو مکمل طور پر انجام دینے میں توفیق نہ پانے کا خصوصی ڈر)(۱۷)

خداوند متعال علم رکھتا تھا کہ یہ نوجوان مستقبل میں مرتکب جرم ہوگا لیکن (سنت الٰہی کے مطابق) اسے کیوں مہلت نہیں دی گئی کہ وہ مستقبل میں اپنے برے اعمال کا گواہ بن جاتا؟ کیا یہ جبر نہیں ہے؟

اگر چہ مندرجہ بالا وضاحتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ:

(الف) اصل زندگی، خدا کی ایک عنایت ہے بغیر اس کے کہ انسان اس کا کوئی حق رکھتا ہو. اس لحاظ سے، زندگی کو جاری رکھنے کے مطالبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی ہے کہ اس کے جاری نہ رہنے کی وجہ کے بارے میں سوال کیا جائے.

(ب) خداوند متعال نے ارادہ کیا تھا کہ حکمتوں اور مصلحتوں کے مطابق اس نوجوان کی زندگی کو ختم کیا جائے،لیکن جواب میں دوسرے پہلو بھی پیش کئے جاسکتے ہیں:

(۱). وہ نوجوان دو لحاظ سے مجرم تھا: اول یہ کہ وہ مرتد فطری تھا، دوسرا یہ کہ اس میں اپنے والدین کی اعتقادی بنیادوں کو خراب کرنے کی طاقت موجود تھی. خداوند متعال نے جو مہلت اسے دیدی، اس سے مشاہدہ کیا کہ وہ اس فرصت سے اپنی اصلاح کے لئے استفادہ نہیں کرتا ہے اور کفر و ارتداد سے ہاتھ نہیں کھنچتا ہے، اس لئے اس کو قتل کرنے کا حکم صادر کیا(۸)

(۲). اگر وہ جوان زندہ رہتا،تو وہ اپنے مخفی قصد و نیت (دوسروں کو کفر کی طرف کھینچنے) کو عملی جامہ پہناتا اور اس صورت میں اس کے زیادہ نقصانات تھے. اس لئے ان نتائج اور دوسرے ناگوار عواقب کو روکنے کے لئے، اس کی زندگی کو ختم کرنے کا حکم صادر ہوا. اس کے علاوہ ظاہر آیات سے معلوم ہوتا ہے کے یہ جوان زیادہ فائدہ بخش نہیں تھا بالغ ہونے کے بعد تھوڑی ہی مدت میں بعض امور اور جرایم کا مرتکب ہو گیا تھا اور اپنے ماں باپ کو گمراہ کرنے کے سلسلہ میں ایک قسم کے اقدامات کر رہا تھا.

(۳). چنانچہ سورہ کہف کی آیت نمبر ۸۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ خداوند متعال نے مقدر فرمایا تھا کہ اس جوان کے والدین کے ایمان اور صبر کے نتیجے میں اس گمراہ جوان کے بدلے انہیں ایک مثالی فرزند عطا کرے. اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جوان کے قتل نہ ہونے

سے صرف اس کے والدین کے گمراہ ہونے کا سبب بن جاتا اور اپنے کفر و ارتداد کی سزا بھی نہ پاتا، اس طرح اپنے ماں باپ کے لئے ایک اور خیر و نیکی پہنچنے میں رکاوٹ بن جاتا. روایات میں اس نکتہ کی مکمل طور پر وضاحت کی گئی ہے کہ خداوند متعال نے ارادہ کیا تھا کہ اس جوان کے بدلے میں، انہیں ایک بیٹی عنایت کرے گا جس کی نسل سے ایک بیٹا پیدا ہوگا اور یکے بعد دیگرے چند نسلوں تک وہ خداوند متعال کے بلند مقام یعنی نبوت پر فائزہ رہیں گے اس طرح کہ اس بیٹی کی نسل سے ستر انبیاء ہو جائیں گے(۹)

نتیجہ کے طور پر، اس نوجوان کو مہلت نہ دینے کی دوسری حکمتوں میں سے یہی باعظمت انبیاء کی نسل کی مصلحت بھی تھی.

یہ بدیہی بات ہے کہ انبیاء کے والدین کا باایمان ہونا سنت الٰہی ہے. اسی وجہ سے اگر بیٹا زندہ رہتا تو اپنے والدین کے کفر کا سبب اور اس سنت الٰہی کی راہ میں رکاوٹ بن جاتا. اس لئے یہ سوال بیکار ہوتا ہے کہ یہ جوان کیوں زندہ نہ رہا اور نسل پیغمبر بھی وجود میں نہ آتی؟

کیا یہ نوجوان اپنے مومن والدین کی وجہ سے خدا کے لطف وعنایت کا حقدار قرار پائے گا کیونکہ وہ اپنے برے اعمال انجام دینے سے پہلے اس دنیا سے چلا گیا، اس لئے اس پر عذاب نہیں ہوگا؟ یا یہ کہ چونکہ خداوند متعال جانتا تھا کہ وہ مستقل میں مرتکب جرم ہوگا، اس لئے اس کو سزا نہیں ملے گی؟

مذکورہ وضاحتوں اور بیانات اور بعد میں آنے والے مطالب کے پیش نظر، یہ استنباط ہوتا ہے کہ قتل کا یہ اقدام، مقتول (بیٹے) کے لئے بھی اور قاتل (حضرت خضرؑ) کے لئے بھی اور مقتول کے والدین کے لئے بھی رحمت کا سبب تھا.

(الف) مقتول کو حاصل ہونے والے فائدے حسب ذیل ہیں:

(۱). اپنے ارتداد کی دنیوی سزا کو پا چکا اور شائد یہی امر اس کی اخروی سزا میں

تخفیف کا سبب بن جائے.

(۲). زندہ رہنے کی صورت میں، وہ اپنے والدین کو کافر بناتا اوران کے کفر و ارتداد کا گناہ بھی اس کے سر چڑھتا۔

(۳). اعتقادی کفر اس جوان کو کج روی، قانون شکنی اور مرتکب گناہ ہونے پر مجبور کرتا او اس کے قتل سے اس کے متوقع جرایم کی فائل ہمیشہ کیلئے بند ہوگئ اور قیامت کے دن وہ ان تمام گناہوں سے بچ گیا جو وہ زندہ رہنے کی صورت میں انجام دیتا.

(٤). وہ اپنے ماں باپ کے حقوق کو ادانہیں کرسکتا اور والدین کو یہی اذیت پہنچانا اس کے گناہوں میں اضافہ ہونے کا سبب بن جاتا اور عاق والدین (نفرت والدین) سے دوچار ہوتا۔

(ب) مقتول کے والدین کو حاصل ہونے والے فائدے حسب ذیل ہیں:

(۱). ان کا ایمان محفوظ رہا.

(۲). اس قسم کے بیٹے کے مقابلہ میں استقامت کامیاب نہیں ہوتی، باپ کا جذبہ اور ماں کی رحمت انہیں نرم رویہ اختیار کرنے پر مجبور کرتی اور ان کا عقیدہ خراب ہوجاتا، لہٰذا وہ ذہنی کشمکش سے بھی محفوظ رہے.

(۳). رضائے الٰہی کے امتحان میں صبر وشکیبائی سے کامیاب ہوئے.

(٤). ایک بدکردار بیٹے کے بدلے میں انہیں ایک پاک و پاکیزہ اور بابرکت بیٹی عطا کی گئی.

(٥). انہیں ستر انبیاء کے جد بننے کی توفیق حاصل ہوئی اوران کے ثواب ومغفرت سے بہرہ مند ہوئے.

(ج) قاتل (حضرت خضر علیہ السلام) کو حاصل ہونے والے فائدے حسب ذیل ہیں:

(۱). قانون الٰہی (ارادہ خدا) کو نافذ کرنے کی توفیق پائی.

(۲). مومن خاندان پر برکت نازل ہونے کا سبب بنے.

(۳). حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے وحی کے اسرار، علم غیب اور باطنی حقائق بیان کرنے کی توفیق حاصل کی.

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے ان نعمتوں کی یوں توصیف فرمائی ہے: خداوند متعال جانتا تھا کہ اگر یہ جوان زندہ رہے گا، تو اپنے ماں باپ کو کافر بنانے کا باعث بن جائے گا اور سب کے لئے فتنہ وفساد کا سبب ہوگا. اس لئے حضرت خضرؑ کو مامور کیا گیا ملی کہ اسے قتل کرنے کا اقدام کریں اور وہ سب (قاتل، مقتول اور مقتول کے والدین) سرانجام الطاف الٰہی سے مستفید ہوجائیں.(۱۰)

حواشی

۱. غلام: وہ نوجوان جس کی موچھیں تازہ نمودار ہوئی ہوں (معجم مقاییس اللغہ)۔

۲. ف‍قتله من غير ترو واستكشاف حال (صافی، ج۲، ذیل آیہ) و، بظاہر فقتلہ میں فاء کے عطف کی جگہ پر ہے. اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت خضرؑ نے کسی مقدمہ کے بغیر اس کے قتل کا اقدام کیا.

۳. کہف۔ ٦٥.

٤. فیض کاشانی، صافی، ج۳، ص۲۵۳، روایت امام صادقؑ.

٥. ملاحظہ ہو: نور الثقلین، ج۳، ص٢٨٤۔٢٨٣ (در ضمیر جمع فخشینا).

٦. تفسیر مجمع البیان: نور الثقلین، ج۳، ص٢٨٦: تفسیر عیاشی: علل الشرایع: تفسیر صافی، ج۳، ص۲۵۵.

۷. علل الشرایع: نور الثقلین، ج۳، ص٢٨٤ (حدیث حضرت امام صادقؑ).

۸. البتہ ارتداد فطری کا بیان اور یہ کہ حضرت خضر نے حکم واقعی کے مطابق عمل کیا ہوگا (اگر چہ اسی زمانہ میں اس قسم کی تشریع کا وجود نہ ہو) صرف بعض لوگوں کے نظریہ کے مطابق ہے جسے پیش کیا گیا ہے.

۹. نور الثقلین، ج۳، ص٢٨٦، ح ۱۷۳ تا ۱۷۰.

۱۰. علل الشرایع: تفسیر صافی، ج۳، ص٢٥٦.